سنگ بستہ
طاہرہ اقبال

سنگ بستہ

(افسانے)

طاہرہ اقبال

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-459-1

کتاب	:	سنگ بستہ
مصنفہ	:	طاہرہ اقبال
اشاعت اول	:	1999ء
اشاعت دوم	:	2013ء
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	350.00 روپے

دوست پبلی کیشنز
پلاٹ 110، سٹریٹ 15، 2/9-I، اسلام آباد
فون: 85-051-4102784
E-mail: dostpub@nayatel.pk

برادرِ مرحوم

جاوید اقبال کے نام

ترتیب

دیباچہ

جب آپ ٹھوس واقعات پر انحصار کرتی ایسی کہانی پر بات کرنا چاہیں گے جو کچھ کچھ باغی ہو، ذراسی رومانی ہو،جس کے بہاؤ میں نفسیاتی الجھنوں کی جھن جھن ہواور جوسماج سے کلی طور پر یوں جڑی ہوئی ہو کہ اس کی حقیقت ہی نہ کھولے اس کے بخیے بھی ادھیڑتی چلی جائے تو سعادت حسن منٹو کو آپ وہیں پائیں گے۔......راہ روکے ہوئے......اور کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے۔منٹو کو حق پہنچتا ہے کہ وہ یوں راہ روک کر کھڑا ہو جائے اور جو چاہے، جیسے چاہے کہہ دے۔آپ اس سے اختلاف کرنا چاہیں سو بار کریں مگر اس کی بات سننا ہم پر لازم ہے۔کہ یہ حق اس نے کہانی کے بیانیے کی طنابیں کھینچ کر اور اس کی روشن لکیر کے سامنے موضوعات کا پرزم رکھ کر حاصل کیا ہے۔

گذشتہ دنوں میرے ساتھ یہ ہوا کہ جب میں ایک مرد افسانہ نگار کی وہ کہانیاں پڑھ رہا تھا جو عورت ذات کے گنجھل کھولنے کے لئے لکھی گئی تھیں،منٹوآ موجود ہوا تھا۔

منٹو پھر آ موجود ہوا جب میں طاہرہ اقبال کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ''سنگ بستہ''پڑھ رہا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں مرتبہ منٹو کے ہونٹوں پر وہی جملے تھرتھرا رہے تھے جو اس نے دامودر گپت کی قدیم سنسکرت کتاب''نٹنی متم''کے اردو ترجمہ''نگار خانہ''کے دیباچے میں لکھے تھے۔میں منٹو کے لفظ دہرا دیتا ہوں۔

''......اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے والا ایک مرد ہے...... یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔اس لئے کہ عورت چاہے بازاری ہو یا گھریلو،خود کو اتنا نہیں جانتی جتنا کہ مرد اس کو جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت آج تک اپنے متعلق حقیقت نگاری نہیں کر سکی اور اس کے متعلق اگر کوئی انکشاف کرے گا تو مرد ہی کرے گا''۔۔

لیجئے صاحب! جو منٹو نے کہا تھا، میں نے ہو بہو دہرا دیا۔لفظ لفظ اسی کا ہے۔لہٰذا سارا گناہ ثواب کا حق دار بھی وہی...... میں نے دہرایا بھی تو کلیجہ ہلتا ہے۔

تاہم مجھے ان کلمات سے ہونٹوں کو یوں آلودہ کرنا پڑا ہے کہ یہ منٹو نے ایسے ہی کہے تھے۔

عورت اپنے بدن کی کھال کے اندر کیوں نہیں اترتی۔شاید اس لیے کہ باہر ٹھہرنے اور ٹھہرے رہنے،اسے سجانے، چمکانے اور جاذبِ نظر بنانے ہی میں اسے لطف آنے لگتا ہے۔میں جب بھی عورتوں کی لکھی ہوئی عورتوں کے بارے میں کہانیاں پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے جملے اس پڑچھے کی مانند ہو گئے ہیں جس میں ماہل سے بندھے پانی سے بھرے ٹینڈے ایک ایک کر کے خالی ہوتے رہتے ہیں مگر اس کے اندر ایک قطرہ پانی بھی نہیں ٹھہرتا۔

تاہم میں بہت سے مرد افسانہ نگار گنوا سکتا ہوں جو عورت ذات کے خوبصورت پہناوے الگ کرتے ہیں،ان کی چکنی کھال کھرچ ڈالتے ہیں اور بدن کی پہنائیوں میں اتر کر روح پر لگے زخموں کو کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔

ایسے میں منٹو کا کہا ہوا ایک ایک لفظ بہت یاد آتا ہے۔

تاہم گزشتہ کچھ عرصہ سے یہ روایت ٹوٹی ہے اور ایسی خواتین افسانہ نگار تواتر سے سامنے آ رہی ہیں جو صرف آئینہ ہی نہیں دیکھتیں اپنا وجود بھی دیکھتی ہیں۔اپنا وجود جس کے اندر وہ اپنے تمام تر جذبوں، حسرتوں،ناکامیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

طاہرہ اقبال کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا ہے جیسے وہ بھی عورت کے بھیدوں کو جاننے ،اسے سمجھنے اور اس کے بجھارت وجود کو بوجھنے کا صدق دل سے تہیہ کیے ہوئے ہیں۔''سنگ بستہ'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ایسے مواقع آتے ہی چلے جاتے ہیں کہ آپ چونکتے ہیں۔دکھی ہوتے ہیں یا فقط لمبی سانس لے کر رہ جاتے ہیں۔کہیں کہیں تو کہانی کی عورتوں کے ساتھ ساتھ آپ افسانہ نگار خاتون کو

بھی صاف صاف محسوس کرتے ہیں اس کے کردار کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہوئے، اسے ایک نئی راہ سجھاتے ہوئے یا پھر مرد کو زیر کرنے کا ایک نیا گر بتاتے ہوئے۔ افسانہ ''شب خون'' کے ظالم جاگیردار باپ شہباز خان کی حویلی میں سسک سسک کر مرنے والی عورتوں میں سے ایک لڑکی رابعہ ہی کو لے لیں، طاہرہ اقبال نے اس کا دل اتنا مضبوط بنا دیا کہ وہ حویلی کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی حالانکہ اونچی دیواروں والی حویلی میں یا تو عورتوں کو پاگل ہوتے دکھایا گیا یا پھر موت کا لقمہ بنتے ہوئے۔

عورت ذات کو کریدتی ان کہانیوں میں افسانہ نگار خاتون کے قلم کرشمے نے ''تپسیا'' کی بوڑھی دلہن زینب کا ایک ایسا کردار بھی تراشا ہے جو اپنے اٹھارہ سالہ شوہر سانول کو نکال کر لے جاتی ہے۔ کہانی کار کے قلم کا سارا وزن بوڑھی زینب کے پلڑے میں ہے۔

کہانی ''آپے رانجھا ہوئی'' کی خوبرو زہرہ جب رحیم داد کو اکھاڑے سے نکال کر اپنے وجود کے اندر سمالیتی ہے اس وجود کے اندر کہ جس میں طلب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے تو اسے پرواہ نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ''اسیر ذات'' کی نومی کو بھی کسی اور کی پرواہ نہیں ہے حتیٰ کہ اپنے شوہر معروف ڈاکٹر رحمٰن آفریدی کی بھی نہیں تبھی تو وہ اٹھارہ سالہ طالب علم ''علی'' کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنا لیتی ہے۔ جب رحیم داد قتل ہوگیا یا پھر نومی، نوعمر علی کا ہم شکل بچہ جن کے اُسے آزاد کر رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ آخر افسانہ نگار خاتون نے یہ دونوں کردار اس قدر ظالم کیوں بنائے ہیں؟ ایک عورت، عورت کے ایسے ہی کردار بناتی ہے مرد کو چیر پھاڑ ڈالنے والے۔ اس کو قدموں کی مٹی چاٹنے پر مجبور کر دینے والے۔

اپنے حسن میں سب کو روند کر گزر جانے والی عورت کے کردار ''مرقد شب'' کی ''ہاجو'' بھی کچھ ایسی ہی ہے، نذیرے کے بیمار وجود کو روند کر بشیرے کے صحت مند جسم پر نظر رکھنے والی...... افسانہ ''یہ عشق نہیں آساں'' کی عاشی اس سے بھی حوصلے والی اور خود غرض نکلتی ہے اتنے حوصلے والی اور اتنی خود غرض کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد شہزاد کو گھر سے ساتھ بھگا لے جاتی ہے اور یہ بھی نہیں سوچتی کہ یوں نہ صرف وہ خود تباہ ہوگی، ایک اور پورا گھرانہ بھی تباہ ہو جائے گا۔

آپ کہانیاں پڑھتے جاتے ہیں۔ بظاہر مظلوم عورت کو بیان کرتی کہانیاں اور سطروں کے بیچ سے عورت ایک اور روپ لے کر جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ وہ روپ جو شاید طاہرہ اقبال نے قصداً نہیں لکھا ہے۔ اس کی عورت ذات سے خود بخود سرزد ہو گیا ہے۔ ہر کہانی کے اندر بیان ہوتی ان کہانیوں میں عورت

کہیں کہیں تو بہت ظالم ہو جاتی ہے اتنی ظالم کہ ہمیں یہ مردوں کا معاشرہ دکھتا ہی نہیں ہے۔''بھوک بھنور'' کی سیانی کے بارے میں آپ کیا فیصلہ دیں گے جو سوہنے سے کہتی ہے۔

''سوہنے تو بھی چھڑا ہے، میں بھی بڈھے سے کہہ کر آئی ہوں کہ اب کے تیرے پاس لوٹوں تو موئے کتے کا ماس کھاؤں..... چل دونوں مل کر رہیں۔''

اور اسی افسانے کی ایک اور کردار چاچی چنو کے بارے میں آپ کا فیصلہ کیا ہے جو سوہنے کے لئے حیا کی سرخی اپنے بوڑھے چہرے پر سجا کر اس کی اچھی چنو بن جاتی ہے۔

مرد گر جاتا ہے کہ عورت اسے گرا دیتی ہے۔اپنے زور سے نہیں، داؤ سے، تدبر سے اور اپنی چالوں سے۔

''خواب کہانی'' کی طلعت کو بظاہر بہت مظلوم دکھایا گیا ہے۔تین مرلے کے مکان میں رہ کر اُجلے خواب دیکھنے والی معلّمہ، جو اپنے محبوب کے دوستوں سے بال بال بچتی ہے۔شادی شدہ شہباز کی دوسری بیوی بن جانے سے بچنے کے لیے بھی اسے بھاگنا پڑتا ہے۔مگر ہمت والی ہے اپنے غرور سمیت بچ نکلتی ہے اور پھر جب اس کی بہن ایک ایسے نوجوان کا رشتہ تجویز کرتی ہے جو بے ساکھی کا سہارا لے کر چلتا ہے تو وہ اسے ناقبول کی سطح پر رکھ کر قبول کرتی ہے۔

مرد میں نقص ہو تو مرد مردود ہو جاتا ہے۔عورت معذور ہو تو مظلوم ہو جاتی ہے لہٰذا اسے وہ ملنا چاہیے جس کے وہ خواب دیکھتی ہے۔

طاہرہ اقبال اپنی کہانیوں کی عورتوں کے خوابوں کو اجالتی چلی جاتی ہے۔اس کے لئے وہ فضا ایسی بناتی ہے کہ پڑھنے والا بھی عورت کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔

کہانی ''حسن کی دیوی'' کی رانو کو لے لیں، کیسے بجلی کے کوندے کی طرح امتیاز پر برستی ہے اور کیسے اس کے بھائی افتخار کی تسکین کا سامان ہوتی ہے وہ حویلی سے باہر اپنے لئے لڑنے والوں کی طرف بھاگتی نہیں حتیٰ کہ ملک صاحب سے اپنے حسن کا خراج پا لیتی ہے۔......افسانہ نگار کا قلم اسے مظلوم بنا دیتا ہے اس قدر مظلوم کہ یہی رانو بی بی جی کے اس کردار پر چھا جاتی ہے جو اپنے بیٹے کے سر پر چپت لگا کر حویلی کے مردوں کو اپنا شغل جاری رکھے چلے جانے کا حوصلہ دیتی ہے۔

طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے کی ایک ایک عورت میں کمال کا گھمنڈ ڈال دیا ہے، وہی گھمنڈ جو عورت میں آ ہی جایا کرتا ہے۔ بظاہر اس کی کہانیاں اس غرور اور گھمنڈ کو موضوع نہیں بناتیں۔ بس ہوتا یوں ہے کہ یہی موضوع کہانی کے بھید کی طرح ان کے بیچ سے برآمد ہو جاتا ہے۔ ''خراج'' کی آمنہ علی اپنے جیسا پس منظر رکھنے والے معمولی شکل وصورت غفور احمد کا رشتہ اسی برتے پر تو ٹھکرائے چلے جاتی ہے اور قبول کرنے کا سے تو دیکھئے......اور کراہت کی انتہاء تو محسوس کیجئے......کیا معمولی شکل وصورت کا پیدا ہونا اور عام پس منظر رکھنا غفور احمد کی مرضی سے تھا۔ کیا اس جبر کے سلسلے سے نکل آنا اس کے بس میں تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً نہیں۔ ہاں محبت کرنا اس کے بس میں تھا، لہٰذا اس نے محبت کی مگر ایک خوبصورت لڑکی کے لیے صرف محبت شاید کوئی معنی نہیں ہوتے۔

کہانی ''سڈن ڈیتھ'' کا مرکزی کردار ڈاکٹر عامر خوب صورت ہے......مگر اس کا جرم یہ ہے کہ وہ مرد ہے لہٰذا ایک عورت کا دل جیتنے سے قاصر رہتا ہے وہ تب ہی قابل قبول ہو سکتا تھا کہ وہیل چیئر کے سہارے حرکت کرنے والی ثمینہ سے وہ وعدہ نبھاتا جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا لہٰذا وہ ناہید کو شادی کا پیغام دے کر ذلیل کمینہ اور فریبی جیسے القابات کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

کہانی ''راکھ ہوتی زندگی کا منظر نامہ'' ہو یا ''پتھر دھڑ والی شہزادی'' اور ''پٹھانی'' مرد سے برتر عورت کا یہی پرغرور روپ کہانی کے عین وسط سے چھلک پڑتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے تراشے ہوئے عورتوں کے یہ کردار منٹو کا جملہ بار بار میرے ذہن میں پھینکتے رہے ہیں تاہم مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب میں نے اس کے مرد کرداروں کو دیکھا۔ مرد کی نفسیات کا کمال باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا ہے اس کے بدن کھانچے میں بیٹھ کر، اس کے وجود میں اتر کر اور اس کی رگ رگ میں دوڑ کر۔

مرد کیسے بنتا ہے اور کیسے بگڑتا ہے۔ کیسے ظالم ہو جاتا ہے اور کیوں سہم جاتا ہے صرف ایک کہانی ''شب خون'' پڑھ لیں سارا عقدہ وا ہو جائے گا۔

شہباز خان کو ثریا بیگم جیسی بیوی نہ ملتی تو وہ کیسے ظالم بن سکتا تھا۔ اس کے بیٹے ناصر خان کو نجمہ جیسی عورت کس طرح بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ''تپیا'' کا سانول ہو یا ''اسیر ذات'' کا ڈاکٹر رحمٰن اور علی،

''مرقد شب'' کا نذیر ہو یا ''آپے رانجھا ہوئی'' کا رحیم داد اور نذیر ایا پھر ''عشق نہیں آساں'' کا شہزاد اور دوسرے افسانوں کے مرد کردار، عورت کے وجود سے محبت، خوف، طاقت حتیٰ کہ زندگی اور موت کشید کرتے نظر آتے ہیں......اور یہ ان کہانیوں کا سچ ہے۔

ایسا سچ جو بولے اور لکھے جانے والے سچ سے کہیں زیادہ راسخ ہے۔ طاہرہ اقبال کی کہانیوں میں عورت کا کردار مرکزی ہو جاتا ہے۔ تصویر کائنات میں محض رنگ بھرنے والا نہیں، پورے سماج کو اپنے محور پر گھمانے والا۔ عورت کے کردار ہوں یا مرد کے۔ طاہرہ نے انہیں تراشا بہت محبت اور خلوص سے ہے، یوں کہ وہ اپنی شباہت مکمل کرتے ہیں، اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہیں، کہانی کے بہاؤ میں چلتے پھرتے ہیں اور کہانی ختم ہونے کے فوراً بعد تحلیل نہیں ہوتے کچھ نہ کچھ پڑھنے والے کے وجود میں رہ جاتے ہیں۔ یہی طاہرہ اقبال کے فن کا کمال ہے۔

یہ وصف اسے بہت آگے لے جائے گا۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ وہ ایسے کردار تخلیق کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی جو لمبی عمر پا لیا کرتے ہیں اور اگلے زمانوں میں جا بستے ہیں۔ بس شرط محنت، حوصلے اور صبر کی ہے۔

محمد حمید شاہد

سنگ بستہ۔ خصوصی مطالعہ

طاہرہ اقبال افسانے کی دنیا میں یوں آئی ہیں کہ سب کو حیران کر گئیں، بالکل اپنے انداز کی، اپنے اسلوب کی۔ان کے ہاں اپنی فنی کھنک ہے، اپنی شفق ہے، اپنے رنگ ہیں اور اپنے شیشے اور اپنے سنگ ہیں۔طاہرہ اقبال کا اولین افسانوی مجموعہ ''سنگ بستہ'' سال گذشتہ کی آخری نثری تخلیق ہے جو سال نو اور نئی صدی کے اُفق پر اتنی تابناکیاں بکھیر گئی کہ جہاں رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔دو سو سولہ صفحات کے اس کہانی نامے میں طلسماتی اظہاریہ، بیانیہ میں جادوگری کی اثریت، تشبیہات میں مشاہدہ کا عمق، منظر نگاری حد درجہ تک جکڑ کر رکھ دینے والی، جزئیات نگاری کا ایک ایسا سلیقہ کہ حسن ادا کا اعلیٰ نمونہ بن جائے، کردار نگاری پر پوری مہارت...... یوں طاہرہ اقبال افسانے کے بسیط سمندر میں اپنے خوبصورت تخلیق کردہ افسانوں کے سلسلے کا ایک خوشنما جزیرہ آباد کیے بیٹھی ہیں جسے دور سے دیکھنے والے ''سنگ بستہ'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔یہ ایک ایسی پناہ گاہ ہے جہاں لہروں کے تھپیڑوں میں آئے ہوئے قاری کو پرسکون لمحات ذوق میسر آتے ہیں۔طاہرہ اقبال اپنے اولین نقش سخن سے ایسی افسانہ نگار بن گئی ہیں جو اپنے قارئین کو مٹھی میں بند رکھنے کا فن جانتی ہیں۔وہ تو لگتا ہے کہ افسانے کے صدر دروازے پر رکیں تو جیسے یہ در خود بخود کسی بڑی باوقار شاہزادی کی خبر پا کر کھل گیا اور دروازے کے اندر سے دور تک جہاں طاہرہ اقبال کا جی چاہا اسے جانے دیا گیا۔''سنگ بستہ'' غیر ضروری جدت طرازیوں کی آلودگی سے پاک سادگی بیان کا ایسا بلند منصب شاہکار ہے جسے سیدھے سبھاؤ کی سچی عکس گری کہا جا سکتا ہے وہ جو سب کو ہم نوا بنا ڈالے۔

طاہرہ اقبال نے کسی بھی جگہ اپنی تخلیق کو فیشن کے کھوکھلے پن کا شکار بنا کر معلق نہیں کیا بلکہ زمین اور زمینی حقیقتوں کی طرح اپنے قاری کے ساتھ ساتھ رہیں۔ یوں جیسے افسانہ نگار، افسانہ اور اس کے قاری ایک اکائی بن گئے ہوں۔ ایسی لازوال فنی اکائی ترتیب دینے والی طاہرہ اقبال کے اس مجموعے میں پندرہ افسانے ہیں جو الگ الگ ذائقے کی شیریں روشنی سے سارے منظر کو تاباں کئے ہوئے ہیں۔ وہ اک ذرا سی بات کو کھول کر اور پھیلا کر سنانے کا فن بخوبی جانتی ہے۔ ان پندرہ جگمگاتے قمقموں سے ایسی ایسی روشنی اور رنگینی اترتی ہے کہ طبق ذوق باغ باغ ہو جاتی ہے۔

''شب خون'' میں جاگیردارانہ جبریت اور جائیداد و وراثت پر کنڈلی مارے ناگ کی طرح کے لالچی جاگیردار کی اپنی بیٹی کے فطری و طبعی ارمانوں کا خون کر دینے کا نوحہ پیش کیا گیا ہے۔ کہانی دہلا دینے والی ہے۔

''تپسیا'' میں دیہی زندگی کی حقیقی تصویر اور بے جوڑ شادیوں میں مخفی سفلی خواہشات کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

''آپے رانجھا ہوئی'' منظر نگاری، کردار نگاری اور باریک مشاہدے کی بہت بڑی کہانی ہے۔ یہ عورت کی بغاوت کی کہانی ہے جب مرکزی کردار زہرہ تنور پر بیٹھ کر عورتوں سے کہتی ہے...... ''کسی سے ڈرتی نہیں ہوں...... وچ پنچایت کہتی ہوں کہ رحیمے کی دیوانی ہوں۔ مغرور ہے تو کیا۔ اس کا یہی غرور تو مجھے لے ڈوبا ہے۔'' اس افسانے میں فن پہلوانی اور اس سارے ماحول کو باکمال انداز میں پینٹ کیا گیا ہے۔

''اسیرانِ ذات'' ذرا سے وقوعے سے تانا بانا بن کر پیش کرنے کا انداز ہے جہاں گہرا مشاہدہ، نفسیات کی دروں بینی، مزاج آشنائی اور کاریگری کی داد دینا پڑتی ہے۔ کیا اعلیٰ کہانی بنائی گئی ہے۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

''مرقدِ شب'' میں ایک قریب المرگ شخص کی عکاسی ہے جس کی محبوب منگیتر کو اس کے توانا و صحت مند بھائی سے بیاہنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے اور اس کردار کی اسی کشمکش نے اس افسانے کو سراپا ایک خوبصورت فن پارہ بنا دیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے...... ''نجو کے دماغ کی نسیں ٹوٹنے لگیں، اسے لگا کہ اس کے اندر پٹرول کے کنستروں میں آگ لگی ہو۔'' اس مجموعے کے ایک افسانے ''بھوک بھنور'' میں لکھی واس قبیلے کو موضوع بنا کر ایک نکھٹو اور جنسی ہوس کے شکار مرد کو پوری نفسیاتی سچائی کے ساتھ ایسی ہنرکاری سے پیش کیا گیا ہے کہ خانہ بدوشوں کی زندگی کی فلم چلتی نظر آتی ہے۔

''پٹھانی'' بھی کردار نگاری، مشاہدے اور منظر نگاری کا شاہکار افسانہ ہے۔ ''سڈن ڈیتھ''، ''پس منظر''، ''خواب کہانی''، ''حسن کی دیوی''، ''خراج'' دیگر افسانوں کے مقابلے میں مختصر ہیں لیکن امارت اظہار میں سخن کے عمدہ شاہکار۔

طاہرہ اقبال کا زیر نظر افسانوی مجموعہ مجموعی طور پر زبان و بیان پر افسانہ نگار کی بھرپور کمان کا آئینہ دار ہے۔ وہ تو بیچ چورا ہے پوری کائنات کا تناظر پینٹ کر دینے پر قدرت و دسترس رکھتی ہے۔ طاہرہ اقبال اپنے قاری کو پانی کی تہوں میں پڑے منظر کو ہو بہو سطح پر لا دکھانے کا ہنر جانتی ہے۔ یوں جیسے ان کا قلم محدب عدسہ ہو جس سے وہ دور کے مدھم منظروں کو جگا کر آنکھ کے قریب سامنے لا دکھائیں۔ ان کے قلم میں بلا کی روانی ہے، اظہار میں بہاؤ ہے، بیانیہ جچا تلا، جزئیات نگاری میں مشاہدہ اور باریک بینی کا کمال لیکن یوں کہ اکانومی آف ورڈز کا بھی احساس رہتا ہے۔ ہر فن پارہ میں منظر نگاری ایسے ہے جیسے خوبصورت فریم ورک کے ساتھ اعلیٰ فنی سطح کی فلم دیکھ رہے ہوں۔ کردار نگاری میں وہ کمال کی مہارت رکھتی ہیں۔ کردار کی نفسیات، حرکات و سکنات، ان کے معاملات اور رویے سب کے سب قاری کو ششدر کئے دیتے ہیں۔ طاہرہ کے کئی افسانوں میں ٹین ایجرز کے کرداروں کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے اور افسانہ نگار نے نفسیاتی مہارتوں کے ساتھ حقیقت پسندانہ رویوں کو اپنے سہل اور جادو صفت انداز بیان سے ان کرداروں کو ایسا رخ دیا ہے جیسا زندگی اور معاشرت میں ہوتا ہے۔ انہونی سے پاک، حقیقی و سچی تصویر گر ہنر کاری سے۔ وہ اپنے بیان و اظہار میں کہانی کے ماحول اور کردار کی نفسیات کے مطابق شبیہ سازی کے عمل کو انفرادیت کے ساتھ گزارتی ہیں۔ ہر ہر تشبیہ کا خمیر زندگی کے سچے مشاہدوں سے اٹھایا گیا ہے اسی لئے قاری احساس ترفع سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے افسانوں اور ان کے کرداروں اور ماحول میں ایک فطری پروسیس دکھائی دیتا ہے۔ جزئیات نگاری کے باب میں اتنے ڈھیر سارے ذخیرہ الفاظ کے باوجود ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا لگتا ہے جو لفظ جہاں استعمال ہوا، لگا اسی جگہ کے لیے تھا۔ طاہرہ اقبال نے اپنے افسانوں کو یوں بیان کیا ہے جیسے انہوں نے اپنے قاری کی گمشدہ چیزیں اس کے سامنے لا کر رکھ دی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اس افسانہ نگار کے ہاتھ میں قلم نہیں کوئی جدید ماڈل کا کیمرہ ہے جو بہترین پیس آف آرٹ کو چشم قاری کے کیسٹ میں تیار کر رہا ہے۔ طاہرہ اقبال زندگی کا کریہہ سے کریہہ رنگ بھی اپنے منفرد اسلوب اور ڈھنگ سے ادا کرتی ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ بہت سے کہانی کاروں

کے برعکس جنگ نہیں لڑتیں، بلکہ منتخب تقسیم لے کر ماہر اور فطین کمانڈر کی طرح ہر قاری کے دِرِاحساس کو کھولتی چلی جاتی ہیں اور یوں قاری کو پورے کا پورا مسخر کر لیتی ہیں۔

طاہرہ اقبال نے اپنے ان شاہکار افسانوں میں زندگی کے اثبات و نفی کو ایسی ہنر کاری سے توازن کیا ہے کہ اپنے لکھے ہوئے ہر ہر زاویے کو تسلیم کرایا ہے۔ کہانی میں جہاں کہیں بھی زمانی تبدیلی کا مرحلہ آیا، افسانہ نگار گریز کے عمل سے اس سہولت کے ساتھ گزر گئیں کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوا۔ افسانے کی حد تک طاہرہ اقبال کے اندازِ سخن سے یوں لگتا ہے جیسے زندگی سے مشاورت کی جا رہی ہو۔ انہوں نے سچ کو واقعی یوں بیان کیا ہے کہ کریہہ اور تلخ حقیقت بھی آرٹ کا دلکش پیکر معلوم ہونے لگتی ہے۔ کسی بڑے مغربی نقاد کا کہنا ہے کہ ہر بڑا فنکار جب اپنی تخلیق کے ساتھ دائرے میں داخل ہوتا ہے تو اپنی جگہ یوں بنا لیتا ہے کہ پہلے سے موجود فنکار تھوڑے تھوڑے سے سمٹ جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ طاہرہ اقبال بھی ''سنگ بستہ'' لے کر افسانہ نگاروں کے مضبوط دائرے میں داخل ہوئی ہیں تو ''سنگ بستہ'' کی خاموش ضرب پر منشی پریم چند سمیت اس دائرے کی ہر آنکھ اسے بٹ بٹ تکنے پر مجبور ہے۔ طاہرہ اقبال نے اپنے ان فن پاروں میں پانی پر خشکی اور خشکی پر پانی تعمیر کر دینے کا کرتب کر دکھایا ہے یہی اس کا اخلاصِ سخن اور معراجِ فن ہے۔ آج کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جدید عہد میں انٹرنیٹ رابطوں کے بعد کتب نویسی کے مستقبل کے بارے میں خوفزدگی اور تذبذب کو وجود مل رہا ہے لیکن طاہرہ اقبال ایسے ہنر مند لکھاری جیسے جیسے سامنے آتے رہیں گے، کتب نویسی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ جو کتاب خود اپنے وجود اور اپنے لکھے ہوئے لفظوں کا بہت بڑا جواز بن سکتی ہے، اسے کسی بھی ترقی یافتہ تکنیکی اٹیک کی پرواہ نہیں ہو سکتی۔ بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر اہلِ بصیرت اور صاحبِ قلم پر ایک فرض بنتا ہے کہ وہ اسے ضرور پڑھے اور اچھے ادب پارے کو شیئر کرے۔

یقیناً بہت تابناک اور فروزاں مستقبل اس افسانہ نگار کا منتظر ہے۔ وہ اپنے پہلے مجموعے کے آتے ہی مستند افسانہ نگار مان لی گئی ہیں۔ بس یہی دھیان رکھنا ہوگا کہ وہ آئندہ کے سفر میں اپنے آپ کو دہرانے سے محفوظ رکھیں ورنہ بہت سے سخن ور دائروں میں سفر کرتے دیکھے گئے ہیں۔

اصغر عابد

شب خون

سہ طرفی بل کھاتی غلام گردشوں کے کھرنڈ فرش پر سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی مورتی پچھلے لامحدود عرصے سے بھٹک رہی تھی۔ سامنے وسیع وعریض صحن کے زندان میں محبوس اپنے اپنے زاویے میں قید اس کی دونوں پھوپھیاں، اس کے باپ کی پھوپھیوں میں سے ایک جو ابھی زندہ تھی۔ اور اس کی بڑی بہن نادرہ چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ جن کے سروں پر پڑی چادریں ماتھے تک ڈھلکی تھیں۔ سر گھٹنوں پر جھکے تھے یہ سب خواتین ایک دوسرے سے یوں الگ تھلگ تھیں، جیسے ایک ہی سمندر سے کٹ، کٹ کر گئی جزیرے، جنہیں کبھی سمندر سیراب نہیں کرتا تھا، جن کی تمام تر روئیدگی کو آسمانی بجلی نے خاکستر کر دیا تھا۔ جن پر صدیوں سے ایک موسم ٹھہرا تھا...... خشک، اجاڑ، خزاں رسیدہ موسم...... نادرہ کے بدن کا شجر بنجر زمین کی کوکھ میں کرنڈ ہو گیا تھا۔ اور آنکھوں میں تھر کے پیاسے صحرا پھیلے تھے۔ گرم کسیلے بھاپ سے سانس لیتے وجود کا بگولا اپنے خشک جزیرے سے اٹھا اور ریتلے سراب کی لہروں پر ہلکورے کھاتا دوسرے جزیرے کے پاس آٹھہرا۔

''رابعہ!'' حلق میں صحراؤں کی ریتلی دھول گھل گئی اور سانس کی نالیوں میں جم گئی۔'' رابعہ!...... کلو کی بیٹی کی شادی ہے۔''

'' آپا! اگر تم بھی کلو کی بیٹی ہوتی نا! تو تمہاری بھی ضرور شادی ہو جاتی......''

رابعہ نے جھکڑوں کی زد پر چکراتے زرد پتوں کو دیکھا جو اپنے بریدہ وجود کو بے دردی سے پٹخ رہے تھے۔

''لیکن تم خان شہباز خان کی بیٹی ہو۔ جس کا جوڑ پورے علاقے میں کوئی نہیں''

''لیکن...... لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ کیوں پیدا کیا خدا نے ہمیں اتنے بڑے خاندان میں'' ریتلے سراب میں جوار بھاٹا ہلکورے کھانے لگا۔ رابعہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی صحن میں آ گئی۔ جہاں دیگر خشک جزیرے پیاس کے صحرا میں بے دم تھے۔ نادرہ کی سسکیاں حویلی کی بلند دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ جن کی بازگشت وسیع و عریض قلعے میں دم توڑ رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں معروف تھا۔ صحراؤں میں گرم، کسیلے جھکڑ تو معمول کی بات ہے نا!...... اس کی بڑی پھوپھی یا شاید چھوٹی، دونوں کی عمروں میں رابعہ کو کبھی فرق معلوم نہ ہوا تھا۔ کسی ایک نے کہا۔

''یہ نادرہ ہر وقت روتی کیوں رہتی ہے؟''

رابعہ نے بگولوں میں چکراتے کنکر، پتھر اور زرد پتوں کو گھومتے ہوئے لاپروائی سے دیکھا، اور کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا اور اگر کوئی تھا تو وہ سب کو معلوم تھا۔

دوسری پھوپھی نے دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹ کر پور کو گڑیا بناتے ہوئے لجا کر کہا۔

''اس کی بے قراری کے دن کم رہ گئے ہیں۔''

اُس کے باپ کی پھوپھی نے اپنے پوپلے منہ میں زبان کو گھما کر تالو سے الگ کیا اور کچھ بولنا چاہا۔ لیکن زبان سونٹھ ہو گئی۔ چہرے پر بچھے جھریوں کے جال میں نارسائی کا کرب پھیل گیا۔ دونوں ادھیڑ عمر عورتیں معمر عورت کی بے بسی پر گھٹی گھٹی ہنسی ہنسیں، پھر ایک نے سر کو مزید جھکا کے دوپٹے کا کونا دانتوں تلے دباتے ہوئے سرگوشی کی۔

''اس کے بال سفید ہو رہے ہیں۔ جب پورے چاندی ہو جائیں گے تو اسے چین آ جائے گا۔''

''کڑا وقت یہی ہوتا ہے جب لڑکی پل پر آن کھڑی ہوتی ہے۔''

دوسری عورت نے لقمہ دیا اور سر گھٹنوں کے دائیں بائیں یوں گھمانے لگی جیسے بل ڈھونڈ رہی ہو۔ معمر عورت نے پھر کچھ کہنے کے لئے زبان کو حلق میں گھمایا اور چند مبہم لفظ ادا کیے۔ جنہیں کوئی نہ سمجھ سکا مگر چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ باقی دونوں عورتوں کی تائید کر رہی ہے۔ رابعہ نے ان عورتوں کے

لئے ایک کریہہ اور زہر آلود قسم کی نفرت محسوس کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

دراصل وہ ابھی ابتدائی زینے چڑھ رہی تھی اور پل صراط کی سنگینی کا اسے شاید اندازہ نہ تھا۔ نادرہ عین پل کی تلواری دھار پر کھڑی تھی اور اگلا قدم اسے ایسی گہری کھائی میں گرانے والا تھا۔ جہاں اس کا انجر پنجر ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتا تھا۔ رابعہ نے حلق میں گندھی کراہت کچی دھول میں تھوک دی۔ ''پاگل...... پاگل عورتیں'' اس کی آواز یک لخت تلخ ہو کر بلند ہو گئی۔

''تم بھی تو...... تھوڑا عرصہ باقی......''

درمیانی عمر کی عورتیں انتقامی ہنسی ہنسیں۔

''ہاں ہاں میں بھی...... معلوم ہے مجھے......''

اس نے ان کی چارپائی کو زور سے پاؤں مارا۔ اور باغ کی طرف نکل گئی۔ دونوں عورتیں ایک دوسری کے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگیں معمر عورت فضا میں بازو لہرا لہرا کر بین کرنے لگی۔ مبہم اور لایعنی بین۔

رابعہ کی ماں اپنے کمرے میں سنگھار میز کے سامنے بیٹھی سنگھار میں مصروف تھی۔ آج شہباز خان ہفتے بھر بعد گھر آ رہا تھا۔ جو زبردست قسم کا عاشق مزاج آدمی تھا اور ثریا بیگم کو ہر لمحے اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لئے سو سو جتن کرنے پڑتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف شہباز خان کا جی بہلانا تھا وہ آج بھی ویسی ہی دلہن تھیں جیسی آج سے تیس برس پہلے بیاہ کر آئی تھیں، وہ حویلی کی دیگر عورتوں کے مقدر کو بدلنے پر نہ تو قادر تھیں اور نہ ہی ان کے غم میں گھلنا دانشمندی سمجھتی تھیں، وہ خود کو ایک حقیقت پسندانہ فلسفیانہ قسم کی منطق سے مطمئن رکھتی تھیں۔ کہ یہ تو اپنے اپنے فرائض کی قید ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی قید کا اسیر ہے۔ ان کا فرض شہباز خان کو خوش رکھنا ہے اور حویلی کی باقی عورتیں، جن میں ان کی بیٹیاں بھی شامل ہیں۔ ان کا فرض اس خاندان کی عزت اور جاگیر کی حفاظت کرنا ہے۔ بس یہ تو اپنے اپنے فرض کی ادائیگی ہے۔ انہوں نے اس مدفن کی گونج کو سنا اور غازے کی تہ مزید دبیز کرنے لگیں۔

نچلے صحن میں نوجوان خادمائیں کام نمٹانے میں مصروف ایک دوسری سے چہلیں کرتی پھر رہی تھیں۔ نومبر کی نرم دھوپ میں ان کے سنولائے چہرے تمتما اٹھے تھے۔ رسوئی میں بیٹھی دو ملازمائیں، بٹیروں کے پیٹ چاک کر رہی تھیں، پاس ہی بیٹھی دو لڑکیاں سرسوں کا ساگ کتر رہی تھیں، چولہوں میں

لکڑیوں کا دھواں سارے صحن میں پھیلا تھا۔ جو ناک، آنکھ اور حلق میں گھس کر زہریلا ہو گیا تھا۔

رابعہ باغ سے نکل کر لان عبور کرتی ہوئی طویل راہداریوں سے گزرتی نادرہ کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے خوبصورت بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ رابعہ خاموشی سے جا کر دیوار سے لگے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''رابعہ! میرے بال خوبصورت ہیں نا؟'' نادرہ نے اسے آئینے میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں!'' رابعہ نے بے دلی سے جواب دیا۔

''لیکن کیا فائدہ...... فائدہ ہی کیا؟'' وہ مجنونانہ انداز میں اپنے بال نوچنے لگی۔

رابعہ نے اسے بالکل نہیں روکا۔ روکنے کا فائدہ؟ لمبے لمبے خوبصورت بالوں کا ڈھیر میز پر، فرش پر لگ گیا۔ پھر وہ ان لمبے سنہرے ریشم کے تاروں میں انگلیاں ڈبو کر سسکنے لگی۔

''رابعہ؟ تم بھی'' رابعہ نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ ''ہاں میں بھی...... مجھے معلوم ہے''

''کیوں...... کیوں آخر......؟'' وہ اٹھ کر دیوار کی سفیدی کو ناخنوں سے کھرچنے لگی۔

''ہمارا قصور کیا ہے،...... کیا قصور ہے؟'' موٹے موٹے آنسو اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر لرزاں تھے۔

''انور خان کے بیٹے کا رشتہ آیا۔ کیا کمی ہے اس خاندان میں'' کیوں کیا انکار انہوں نے، رابعہ؟...... کچھ نہ دیں، کچھ بھی نہ دیں، لیکن......''

اس کے ہاتھ چھل گئے تھے پوروں سے خون کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ اور وہ روتے روتے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

''آپا''...... رابعہ نے الماری میں بند، خوبصورت گڑیا کو دیکھا۔

''ہم ایک بڑے باپ کی بیٹیاں ہیں، ہم کوئی معمولی لڑکیاں نہیں ہیں کہ معمولی لڑکیوں کے سے انجام سے دوچار ہوں''

''لیکن ہم انسان تو ہیں نا، سانس لینے کے لئے تھوڑی سی ہوا......''

رابعہ اس کا اگلا جملہ سنے بغیر باہر نکل گئی۔ دونوں ادھیڑ عمر عورتیں ایک دوسری کو ناخنوں سے نوچ رہی تھیں۔ اور ہذیان بک رہی تھیں اور معمر عورت منہ پر پلو ڈالے مبہم الفاظ میں بین کر رہی تھی۔ خادمائیں ان کی ہیبت کذائی پر چھپ چھپ کر ٹھٹھے لگاتی پھر رہی تھیں۔ تبھی شہباز خان حویلی میں داخل ہوا اور تیز تیز

چلتا اپنے رہائشی کمروں کی طرف چلا گیا۔ دونوں ادھیڑ عمر عورتیں ایک دوسری سے بندھی کھاٹ کے نیچے گھس گئیں، معمر عورت یوں چپ ہو گئی جیسے اس کا بٹن آف کر دیا گیا ہو۔ رابعہ برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ البتہ نادرہ کی سسکیاں بلند فصیلوں سے لپٹے جھکڑوں میں گھلتی رہیں۔ دو تین خادمائیں حسب معمول دوڑتی ہوئی گئیں اور نادرہ کو اطلاع دی کہ بڑے خان صاحب آ گئے ہیں۔ اس لئے وہ خاموش ہو جائے لیکن آج خلاف معمول اس کی سسکیاں کمرے کے روزنوں سے بہتی ہوئی طویل غلام گردشوں میں رینگتی رہیں۔

باہر گلی میں سے کوئی برات گزر رہی تھی، ڈھول اور باجے کی آواز حویلی کی بلند اور مضبوط فصیلوں میں سے در آئی۔

نوکرانیاں برات دیکھنے کے لئے دوڑتی ہوئی چھتوں پر چڑھ گئیں۔ حویلی کی مکین عورتیں جن کی بصارتیں حویلی سے باہر دیکھنے کی صلاحیت سے عاری تھیں۔ جن کی سماعتیں مخصوص آوازوں کے سوا کسی بھی آواز کے ادراک سے نا آشنا تھیں۔ جو نہیں جانتی تھیں کہ باہر دنیا اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے یا ساکت ہو گئی ہے، باہر شور مچاتا ہجوم ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ ان کی منجمد بصارتوں اور سماعتوں کو کچھ بھی دیکھنے یا سننے کی ہوس نہ ہوئی۔

سرما کی نرل دھوپ آموں اور سنگتروں کے پیڑوں کو چومتی ہوئی لان میں بھرے گلاب اور چنبے کے جھاڑوں پر بچھ گئی تھی۔ نچلے صحن میں کام کاج میں مصروف نوکرانیوں کے گال تمتما اٹھے تھے۔ داہنے ہاتھ والے پختہ صحن میں بیٹھی تینوں معمر عورتوں کو ملازمائیں دوپہر کے کھانے کے لئے اندر لے جانے پر اصرار کرنے لگیں۔

''نہیں ہم نہیں جائیں گی۔''

دونوں ادھیڑ عمر عورتیں ایک دوسرے سے لپٹ کر گڑگڑانے لگیں۔

رابعہ نے ان عورتوں کو روتے ہوئے سنا اور اپنے اندر ایک قوی قسم کا جذبہ ترحم محسوس کیا۔ جیسے وہ ان مظلوم بچیوں کی بیوہ ماں ہو۔

رابعہ آموں کے گھنے پیڑوں کی یخ بستہ چھاؤں میں بیٹھ گئی تھی جن میں چھپی کوئل بے مقصد کوک کوک کر باؤلی ہو رہی تھی۔ وہ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے عورتوں کی گھٹی گھٹی سسکیاں سنتی

رہی۔ جن میں معمر عورت کے مہمل، بھدے لفظ روڑے سے انکار ہے تھے۔ جیسے تعفن زدہ پانی کھر درے پتھروں پر بہہ رہا ہو۔ پھر شاید وہ کمرے میں جانے پر رضا مند ہو گئیں۔ ایک پھوپھی کے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے کی آواز آنے لگی۔ جس کا ٹخنہ مڑا ہوا تھا اور جو ایک پاؤں اٹھا کر اور دوسرا گھسیٹ کر چلتی تھی۔ اس کی حقیقت معمر خادماؤں کی زبانی کچھ یوں مروی تھی کہ یہ پھوپھی جب چار پانچ برس کی تھی کہ درخت سے گری اور ٹخنہ اپنی جگہ سے بل گیا۔ اس کے والد محترم گھر پر موجود نہ تھے۔ ماں نے غنیمت جانا اور بچی کو ایک وفادار خادمہ کے سپرد کیا کہ دوسرے گاؤں میں لے جا کر ہڈیوں کے ماہر ایک پہلوان سے ہڈی چڑھوا لائے۔ لیکن شومئی قسمت کہ خان صاحب بھی اسی روز شکار سے لوٹ رہے تھے۔ وہ ملازمہ راستے میں ہی پکڑی گئی۔ اور بڑے خان صاحب نے اس سنگین جرم پر اپنی بیوی اور نوکرانی کو سخت سزا دی۔ اس سے بڑا اور کیا گناہ ہو سکتا ہے کہ اس خاندان کی بچی پر کسی غیر مرد کی نگاہ پڑے۔ پھر بچی کی دلدوز چیخیں اور اس کی ماں کی دلگداز منتیں اس حویلی کی کوہ ہمالیہ جیسی بلند و بالا اور اٹل روایات کو نہ توڑ سکیں اور بالآخر بچی ہمیشہ کے لئے لنگڑی ہو گئی۔

نوری دوڑتی ہوئی آئی اور رابعہ کے قریب زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

چھوٹی بی بی جی...... وہ میرا آدمی ہے نا منیرا...... "ہاں"...... رابعہ نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے بے دلی سے جواب دیا۔

"وہ...... یہ اپنا ڈاکٹر ہے نا...... یہ ہسپتال والا...... وہ...... اس کے پاس چھوٹا ڈاکٹر ہے...... بہت محبت رکھتا ہے منیرے سے...... بڑا نیک آدمی ہے......"

رابعہ نے شاید اس کی بات سنی ہی نہیں اس لئے کوئی جواب نہ دیا۔ نوری یوں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اس کے دل کی کشادگی سے کہیں بڑا راز ہو جو اس کے محدود سے سینے کا حصار توڑ رہا ہو۔ اور اس کا وجود اس بوجھ کو سہار نہ پا رہا ہو۔

"بی بی جی! یہ...... ایک رقعہ ہے آپ کے نام!"

یہ کہتے ہوئے نوری کے چہرے پر دہشت پھیل گئی ہونٹ لرزنے لگے اور آنکھوں میں خوف کا گدھ ٹھونگیں مارنے لگا۔

"میرے نام"

رابعہ نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ پکڑ لیا۔ اور ایک ہی بار میں چاک کر دیا۔
نوری ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر چکی تھی اور اب بے وقوف مجرم کی طرح تمام ثبوت چھوڑ کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔
رابعہ کی نگاہیں تحریر کے لفظوں پر پھسلنے لگیں۔
رابعہ صاحبہ!
میں آپ کو مخاطب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جو اس حویلی کے قوانین کے مطابق سنگین جرم ہے۔ میں یہ جرم کرنے کی خود میں جرات پاتا ہوں اور سزا کا متمنی ہوں۔ میں نے شہباز خان کی اس پر اسرار حویلی کے جناتی قسم کے قوانین اور مافوق الفطرت اصولوں کو سنا ہے اور حیرت زدہ ہوں۔ محض اس جاگیر کو بٹوارے سے بچانے کے لئے یہ مفروضہ گھڑ لیا گیا کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا جوڑ ابنانا خدا بھول جاتا ہے۔ خدا کبھی کچھ نہیں بھولتا بھول ہمیشہ انسان کے حصے میں آتی ہے۔ میں اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس ناانصافی کو ضرور محسوس کرتی ہوں گی۔ آپ جیسی لڑکی کو اس نسل در نسل ہونے والی بربریت کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے، کیا اس حویلی کی پابند سلاسل لڑکیوں کے دلوں میں یہ ارمان کبھی نہیں جاگتا۔ کہ سہ پہر ڈھلے اپنی دہلیز پر بھاری بوٹوں کی آہٹ سنیں اور ان کے آنگن معصوم بچوں کی کلکاریوں سے بھر جائیں،
ڈاکٹر یاور
رابعہ تیورا کر اٹھی۔ ''نوری!......اونوری!......!''
تمام خادمائیں حیران تھیں۔ اتنی بلند آواز میں تو وہ کبھی زندگی بھر نہ بولی تھی۔ وہ آموں کے پیڑوں سے نکل کر تین زینے طے کر کے لان میں لگی کیاریوں کو روندتے ہوئے غصے سے کھول رہی تھی۔ اور کاغذ کو ہاتھوں میں مسل رہی تھی۔ اس کے پاؤں تلے چھوٹے چھوٹے پودے چڑ مڑ ہو رہے تھے۔
''وہ سمجھتا کیا ہے! وہ مجھے؟...... مجھے میرے باپ کے خلاف اکسا رہا ہے۔ وہ...... مجھے کمی کمین لڑکیوں جیسا سمجھا ہے۔ جو اپنے دل میں غیر مردوں کا خیال لاتی ہیں۔ یہ میری اور میرے خاندان کی توہین ہے۔ اس کی اسے سزا ملے گی۔ ضرور ملے گی۔''
''نوری کدھر ہے'' وہ چیخی تو تینوں معمر عورتیں اپنے اپنے کمروں سے سر نکال کر اسے حیرت سے

یوں دیکھنے لگیں۔ جیسے چوہے بلوں میں سے جھانک رہے ہوں۔ اس نے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ لال انگارہ آنکھوں سے دروازوں سے جھانکتی عورتوں کو دیکھا۔ جو اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے اور کرلانے لگیں۔

''رابعہ! ہمیں مت مارنا...... ہمیں کچھ نہ کہنا۔ کچھ مت کہنا''...... اس نے کریہہ انگیز نفرت محسوس کی ان سے۔

''پاگل...... پاگل عورتیں۔'' اس نے ان کی طرف منہ کر کے تھوکا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ وہ پاؤں پٹختی برآمدے میں آ گئی۔ اور سامنے لگے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ غصے میں بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ نیم پاگل سی......

اس نے گردن گھما کر روتی ہوئی عورتوں کو دیکھا۔ کتنی مشابہت تھی۔ دونوں شبیہوں میں...... اس کے دل میں ان عورتوں کے لئے ممتا بھرا جذبہ رحم پیدا ہوا۔ اس کا جی چاہا انہیں کندھے سے لگا کر تھپک تھپک کر سلا دے۔ تبھی اس کا بڑا بھائی ناصر خان اندرونی گیٹ سے داخل ہوا۔ اس کے ساتھ جدید تراش خراش والے لباس میں ملبوس ایک لڑکی تھی۔ جو بے نقاب تھی، رابعہ اسے دیکھ کر یوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو ئی جیسے اسے کھڑا کرنے والا بٹن دبا دیا گیا ہو۔ ناصر خان نے دوران تعلیم شہر میں ہی شادی کر لی تھی۔ اور اس جرم کی پاداش میں حویلی میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ آج وہ کئی برسوں کے بعد خود ہی چلا آیا تھا۔

ناصر خان اپنی بیوی کو لے کر شہباز خان کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں سے باپ بیٹے کے بولنے کی اونچی اونچی آوازیں آتی رہیں۔ بالآخر ناصر خان نے اپنے حصے کی جاگیر کا مطالبہ کر دیا۔ انجام کار شہباز خان نے اپنی بہو کو تسلیم کر لیا۔ اور نجمہ حویلی میں رہنے لگی۔ رہی تو وہ محض پندرہ بیس دن ہی اور دیہاتی زندگی کے جمود سے گھبرا کر شہر بھاگ گئی۔ لیکن یہ پندرہ بیس دن حویلی کی صدیوں سے جامد فضا میں ارتعاش پیدا کر گئے۔ نجمہ کے ملبوسات، زیورات، ہار سنگھار...... یہ بھی پہنا جاتا ہے، یہ بھی اوڑھا جاتا ہے۔

حویلی کی ان سونٹھ ہوئی عورتوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ وہ بھی ایسی ملنسار تھی کہ دو ہی دن میں حویلی کی تمام ملازماؤں کے نام اور ان کے تفصیلی داخلی و خارجی حالات سے واقف ہو گئی۔ وہ ہر ایک کو اس کے نام سے پکارتی۔ جیسے اس کی برسوں پرانی سہیلیاں ہوں۔ اور گھنٹوں منڈلی لگائے بیٹھی راز و نیاز کرتی۔ نوکرانیاں جنہوں نے بڑی بی بی جی سے سوائے احکامات اور ڈانٹ ڈپٹ کے کچھ نہ سنا تھا۔ اور باقی

پانچوں عورتوں کو رونے اور مجنونانہ حرکات سے ہی فرصت نہ تھی۔اور وہ انہیں تقریباً دیوانہ سمجھ کر ترس کھایا کرتی تھیں۔زندگی اور جذبوں سے بھرپور نجمہ کو پا کر نہال ہو گئیں۔اور اپنے تمام تر گفتہ و ناگفتہ مشہور و خفیہ ہر قسم کے رازوں میں نجمہ بی بی کو شریک کرلیا۔ان نوعمر غریب دیہاتی لڑکیوں کے اور راز ہی کیا تھے...... ہاں، ہر لڑکی کا کسی نہ کسی نوجوان سے معاشقہ ضرور تھا۔اور یہی ان کا سب سے بڑا راز ہوتا تھا۔

اگرچہ یہ راز ہر ایک کو معلوم ہوتا تھا۔لیکن خود ان کی اپنی نگاہ میں بہت پوشیدہ اور اہم تھا اور جس کسی کو وہ اپنے اس راز میں شامل کرتی تھیں۔گویا اس پر اپنی محبت اور اعتماد کی مہر ثبت کر دیتی تھیں، اور اس معیار پر نجمہ بی بی پوری اتری تھیں۔وہ اپنے اور دوسروں کے موجودہ، ماضی میں سرزد ہو چکے اور مستقبل میں رونما ہونے والے تمام تر معاشقے بیان کیا کرتیں۔یہ رومانوی قصے تو خیر ہمیشہ سے ہی حویلی کے اندر کام کرنے والی لڑکیوں اور حویلی کے باہر خدمت گزاروں میں چلتے ہی رہتے تھے۔یہ غریب لڑکیاں اور لڑکے جنہیں کھانے کو ہمیشہ جھوٹن اور پہننے کو ہمیشہ اترن ہی میسر آتی تھی۔ان کی اس ہر لمحہ مسرور و شاداں رہنے والی خوش مزاجی کا سرچشمہ غالباً یہی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں، ورنہ ان کی زندگی کی ابتداء اور انتہا صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر جاری و ساری تھی۔جن میں کبھی کوئی نیا پن کوئی انکشاف، کوئی انچ بھر تبدیلی کا امکان نہ تھا۔یہ عمل تو ہمیشہ سے جاری و ساری تھا۔لیکن کسی کو بلند آواز میں کوئی تذکرہ کرنے کی کبھی جرات نہ ہوئی تھی اور نجمہ نے تو ان نہاں خانوں کو یوں طشت از بام کیا کہ خلوت کو جلوت بنا ڈالا۔اور ہر شخص نے میر مجلس کے روبرو دل کھول کر رکھ دیا۔وہ اپنا اور ناصر خان کا فسانہ عشق بھی مزے لے لے کر سناتی۔اور سامعین دم بخود سنتے۔خود نجمہ کے قہقہے حویلی کے چہار جانب پھیل جاتے۔خان صاحب سنتے اور سر جھکا کر نظر انداز کر جاتے۔لڑکیاں اپنی ملاقاتوں کا حال، گھسے پٹے مکالموں کے تبادلے اور ایک دوسرے کے احساسات یوں بیان کرتیں، جیسے دنیا میں ایسے انوکھے اور اہم واقعات کبھی سرزد ہی نہ ہوئے ہوں۔کبھی کوئی لڑکی لجا کر اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

''وہ کہتا ہے۔تیرے لئے تو میں جان دے دوں''...... جان...... لڑکیوں کی نگاہوں کے سامنے اس نوجوان کی خون میں تر بتر لاش گھوم جاتی۔کئی حسد و رشک سے جل اٹھتیں۔اور اپنے عاشق کے مکالمے دہرانے لگتیں جو اس سے بھی سنگین تر ہوتے۔کبھی کسی لڑکی کو کوئی تحفہ ملتا۔بس یہی کوئی سستی سی انگوٹھی۔چھلا یا ناک کی کیل وغیرہ۔اسے ہر آنکھ یوں جانچتی، گویا اس کی پرت در پرت تہ میں کسی ایسی زبان میں کچھ

ایسے جملے لکھے ہیں جو ان کی سمجھ میں آتے بھی ہیں اور نہیں بھی...... اور بس پڑھ پڑھ کر باؤلی ہوئی جاتی ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ ہیجان خیز چیخیں اور سنسنی خیز قہقہے اس منڈلی سے ابھرتے اور سارے میں پھیل جاتے۔

رابعہ کو نجمہ کی ان کارگزاریوں سے سخت چڑ محسوس ہوتی تھی۔ یہ معمولی معمولی لڑکیاں جنہیں کبھی کسی نے منہ نہ لگایا تھا۔ وہ اس درجہ ان سے گھل مل گئی تھی جیسے وہ اس کی ہم پلہ ہوں اور جس قسم کی باتیں وہ کرتی اور سنتی تھی شاید شرفا کی بہو بیٹیاں اس کا تصور بھی نہ کر سکتیں۔ ان چھوٹی ذات کی لڑکیوں کا تو اس طرح کی فضولیات ہی مشغلہ ہے۔ تب اچانک اسے ڈاکٹر یاور کا وہ خط یاد آ جاتا جس کے پرزے اس کی کتاب کے سینے سے ابھی تک چمٹے تھے اور اسے انہیں ضائع کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ تب اسے لگتا جیسے وہ اپنی اعلیٰ وارفع سطح سے گر کر ان معمولی لڑکیوں کے زمرے میں آ گئی ہے۔

''نہیں...... نہیں''...... اس کے اندر ایک شور سا اٹھتا۔ وہ مٹھیاں بھینچ لیتی۔ پتہ نہیں کیوں ابھی تک یہ جرم اس کی ذات تک ہی محدود تھا۔

نادرہ ہر لمحہ نجمہ کی منڈلی میں موجود رہتی لیکن چپ چاپ کونے میں دبکی ہوئی جیسے آداب محفل سے ناواقف ہو اور جو زبان یہاں بولی جاتی ہے۔ اسے سمجھنے سے قاصر ہو۔

کئی بار اس نے رابعہ سے کہا

''رابعہ! ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سب لڑکیاں...... سب ہی تو......''

''مجھے معلوم تھا'' رابعہ اس کی بات سختی سے کاٹتی۔ ''ان چھوٹے خاندانوں کی لڑکیوں نے اور کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔''

''یہ تو وتیرا ہے ان کا''...... تم اعلیٰ خاندان کی شریف لڑکی ہو کر ان کے کرتوتوں پر رشک محسوس کرتی ہو۔''

نادرہ حویلی کے اوپر تنے آسمان کے محدود ٹکڑے میں کچھ تلاش کرتے ہوئے کہتی ''نہیں'' میں یہ تو نہیں کہہ رہی تھی۔ لیکن...... لیکن ہم انسان تو ہیں نا......''

''ہاں ہیں لیکن ان جیسے معمولی انسان نہیں''

''پتہ نہیں...... پتہ نہیں۔'' نادرہ کی آنکھوں میں بسے تھر کے صحراؤں میں ریت اڑنے لگتی۔

تینوں معمر عورتیں تو جس طرف سے نجمہ گزر جاتی، ادھر سے پلو کی اوٹ کر لیتیں۔ جیسے ان کا اس

سے پردہ ہو، کبھی کبھی وہ ان کے بیچ آن بیٹھتی اور چہکار کر کہتی ۔

''لاؤ پھوپھی! میں تمہاری چوٹی گوندھ دوں ۔اللہ قسم! ایسے خوبصورت بال ہوں گے تمہارے جوانی میں کہ اگر کوئی اس قلعے بند میں کسی طرح رسائی پالیتا اور خوش قسمتی سے دیکھ لیتا تو مر ہی جاتا، مجنون ہو کر صحراؤں کی خاک چھانتے چھانتے تباہ و برباد ہو جاتا......

ظاہر ہے تم اسے کہاں مل سکتیں؟ بے چارہ زیب النساء زیب النساء پکارتا پکارتا ختم ہو جاتا۔''

زیب النساء یوں شرم سے لال ہو جاتی ۔جیسے بارہ برس کی بچی کے سامنے اس کے منگیتر کا ذکر کر کے اسے چھیڑا جائے ۔وہ لجا کر سر گھٹنوں میں دھنسا لیتی ۔

''جاؤ جی! ہم سے ایسی بے شرمی کی باتیں نہ کرو......''

نجمہ کو افسوس ہوتا ان عورتوں کی ذہنی سطح بچپن کی سرحد سے ارتقا نہ پا سکی تھی ۔وہ دہشت زدہ ہو جاتی وہ چلتی پھرتی لاشوں سے روز ملتی تھی جو اٹھتی بیٹھتی تھیں، کھاتی پیتی تھیں، لیکن مردہ تھیں، نہ جانے خدا کیوں انہیں اتنا بے تحاشا حسن بخش دیتا ہے، یہ پاگل کر دینے والا حسن تو ان بدنصیب عورتوں کے لئے مزید اذیت کا باعث ہوتا ہوگا۔

آہستہ آہستہ یہ عورتیں نجمہ کے سائے سے بھی بھاگنے لگیں، وہ کمروں کی کنڈیاں لگائے دم سادھے بیٹھی رہتیں ۔جیسے حویلی میں کوئی اوباش شرابی مرد دندناتا پھر رہا ہو۔

جس روز نجمہ رخصت ہوئی ۔حویلی کا مخصوص سکوت پھر بحال ہو گیا۔تینوں معمر عورتیں اپنے کمروں کی کنڈیاں کھول کر باہر اپنی مخصوص جگہ پر آن بیٹھیں ۔رابعہ کے معمول میں تو کوئی فرق ہی نہ آیا تھا۔ وہ حسب معمول آموں کے جھنڈ میں بیٹھی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی ۔اور نادرہ اپنے کمرے میں پھر بند ہو گئی ۔دن بھر اس کی سسکیاں حویلی کی اونچی دیواروں، طویل غلام گردشوں، اور وسیع و عریض صحن میں رینگتی رہیں ۔رات کو سونے والوں کی کئی کئی بار نیند ٹوٹی ۔لیکن اسے معمول کا پس منظر تصور کر کے برداشت کرتے رہے، لیکن خان صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا، وہ کمبل کھینچ کر اٹھ بیٹھے ۔

''یہ کم بخت ناقابل برداشت ہوئی جاتی ہے ۔اس کے منہ میں جا کر خاک جھونک دو۔''

ثریا بیگم نے دھیرج سے کہا'' چھوڑیں آپ، رونے دیں......رو، رو کر خود ہی تھک جائے گی اور پھر چپ ہو جائے گی۔''

''اس پر اچھی طرح واضح کر دو۔اسے خاندان کی روایت سے پھر آگاہ کرو.....اسے ذہن نشین کروادو کہ اس خاندان کی لڑکی کا جوڑا خدا پیدا ہی نہیں کرتا۔ یہ اس جاگیر کی حفاظت پر قربان ہونے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔اگر یہ رو رو کر مر بھی جائے تو بھی.....''

ثریا بیگم اٹھ بیٹھیں اور شوہر کی دلجوئی کرتے ہوئے بولیں۔

''اوہو، دفع کریں اب..... آپ بھی بس بچوں کی سی ضد کرنے لگتے ہیں۔ پھر دلار سے بولیں۔ کیوں طبیعت پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ یہ بے وقوف لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔ یاد ہے جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو آپ کی یہ دونوں بہنیں کیسے رات، رات بھر چیخنی، چلاتی تھیں۔ بلکہ انہیں تو دورے پڑتے تھے اور آپ..... ثریا بیگم زور سے ہنسیں''تو بہ حد ہے۔'' آپ تو کانوں میں روئی لے کر سوتے تھے۔''

پھر وہ ماضی کی مضحکہ خیز باتیں دہراتی ہوئی، بے تحاشا قہقہے لگاتے ہوئے اٹھیں۔ اور تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر اچھی طرح بھاری پردے ہموار کر دیئے۔ پھر شہباز خان کے ساتھ چپک کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''یہ ان پاگل لڑکیوں کی زندگیوں میں چند سال ایسا جوار بھاٹا آتا ہے، پھر اندر ہی اندر گھٹ کر گنگ ہو جاتی ہیں۔ جیسے آپ کی بہنیں ہو گئی ہیں۔''

خان صاحب کے لبوں کے گوشے بھی پھیل گئے۔

''دیکھیں، اب اس بے وقوف لڑکی کے پیچھے میرے حصے کا یہ تھوڑا سا وقت تو برباد نہ کریں نا۔''

خان صاحب نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دماغ کا بوجھ اتار کر پھینک دیا۔ کمرے کے بند دروازوں میں سے بھی اس کی چیخیں گھٹی گھٹی چلی آ رہی تھیں۔ ثریا بیگم کا جی چاہا۔ جا کر کہیں۔''اے بدبخت لڑکی..... کیوں تیری شامت آئی ہے؟۔ آج کتنے دنوں بعد تیرا باپ گھر آیا ہے۔ تجھے کچھ احساس ہے۔'' لیکن انہوں نے اپنے اس ارادے کو فضول سمجھ کر ترک کر دیا۔

اگلی صبح جب سب لوگ بیدار ہوئے تو نادرہ کے کمرے میں مکمل سکوت تھا۔اس نے دوپہر تک دروازہ نہیں کھولا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، سہ پہر ڈھلے رابعہ آموں کے جھنڈ سے اٹھی، اور لان کو عبور کرتی ہوئی نادرہ کے کمرے کی طرف آئی۔ کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑی رہی، پھر گھوم کر پچھلے دروازے پر آئی ہاتھ لگایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ نادرہ سنگھار میز پر سر رکھے سو رہی

تھی۔ گہری اور پر سکون نیند۔ باچھوں اور نتھنوں سے خون بہتے بہتے رک گیا تھا۔ چیونٹیوں کی قطاریں ناک میں گھس رہی تھیں، قمیض کا گریبان خون میں خشک ہو کر اکڑ گیا تھا۔ کمرے میں جا بجا گرے خون کے قطروں کے گرد چیونٹیاں دائرے بنائے ہوئے تھیں۔ میز پر پڑے گلاس کے پیندے میں کپاس پر چھڑکنے والے زہر کے چند قطرے جمے تھے۔ گہرے، سیاہ قطرے جیسے موٹے، کالے آنسو ابھرے ہوں۔ رابعہ کے منہ سے ایک چیخ ابھری، لیکن اس نے آواز کو حلق میں ہی دبا لیا...... کیا فائدہ، کسی بھی ردعمل کا آخر فائدہ...... اس نے دروازہ کھول دیا۔ اور خود داہنے ہاتھ والے پختہ صحن میں آ گئی۔ جہاں تینوں معمر عورتیں چار پائیوں پر بیٹھی تھیں۔ ماتھے تک ڈھلکی چادریں، جھریوں زدہ بوڑھے چہروں پر عجیب سا بچپنا۔ جیسے وہ ذہنی طور پر کبھی بالغ نہ ہوئی ہوں۔ ایک عورت نے انگوٹھے پر دوپٹے کا کونا لپیٹے پور کو گڑیا سی بناتے ہوئے کہا۔

''نادرہ کل سے باہر نہیں نکلی کیا کر رہی ہے اندر؟''

''وہ مر گئی ہے''

رابعہ نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

جیسے یہ کوئی اہم اطلاع نہ ہو...... تینوں عورتوں پر اس غیر اہم اطلاع کا انتہائی غیر اہم اثر مرتب ہوا۔ شہباز خان کی پھوپھی جو پچھلے کئی برسوں سے قوت گویائی کھو چکی تھیں، انہوں نے زبان کو تالو سے الگ کر کے حلق میں گھما کر کچھ بولنا چاہا، لیکن بے بس ہو گئیں۔

ایک جوان عورت اور تین معمر عورتیں چاروں سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں جیسے ان کے حرکت و عمل کے نظام کے سارے بٹن جس بکس میں بند ہیں اس کی کنجیاں گم ہو چکی ہیں۔

اچانک نادرہ کے کمرے سے کسی ملازمہ کے بے تحاشا چلانے کی آوازیں آنے لگیں، اور دروازے پر ملازماؤں کا ہجوم ہو گیا۔ صحن میں بیٹھی چاروں عورتیں، سارے مجمع سے یوں الگ تھلگ تھیں۔ جیسے اس سارے تماشے کی وہ تماش بین بھی نہ ہوں۔

خان صاحب اپنے کمرے سے نکل کر باہر آئے، انہوں نے ہجوم کو خاموش کرواتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی پر مت روؤ، اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی معمولی خاندان کی معمولی لڑکی نہ تھی...... مجھے فخر ہے اس کی شہادت پر۔''

انہوں نے مجمع پر سرخروانہ نگاہ ڈالی صحن کے مٹھ میں کرنڈ اور سونٹھ ہوئی عورتوں نے اجنبی اجنبی

نگاہوں سے شہباز خان کو دیکھا۔ گویا، جس زبان میں وہ بول رہے ہیں ان مفاہیم کا ادراک ان کی منجمد سماعتیں نہیں کر سکتیں، خان صاحب نے اپنی پُر تفاخر تقریر جاری رکھی۔

''اس کا جنازہ رات کو اٹھے گا۔ جس لڑکی کو سورج نے بھی ننگی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ اسے مرنے کے بعد بھی کوئی نگاہ ملوث نہ کر سکے گی۔''

ثریا بیگم رو رہی تھیں اور بے تحاشا رو رہی تھیں۔ لیکن اندرونی اطمینان ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ ایسا مطمئن اور ایسا مغموم چہرہ ایک عجیب تاثر پیش کرتا تھا۔ رابعہ نے اس ساری کاروائی کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا۔ ایک آنسو بھی اس کی آنکھ سے نہ پھوٹا تھا۔

رات جب نادرہ کو دفن کرنے کے بعد خان صاحب واپس آئے تو آسمان کو گھیرے سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا، گرج اور چمک، حویلی کی بلند فصیلوں اور آموں کے پیڑوں میں کوندرہی تھی۔ خان صاحب نے ایک ملازم کو حکم دیا'' جاؤ بھاگ کر جاؤ۔ اور قبر پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو کسیاں دے آؤ۔ اور انہیں تاکید کرو کہ اگر بارش ہو جائے تو پورا خیال رکھا جائے کہ قبر کہیں سے بیٹھ نہ جائے۔ یا ننگی نہ ہو جائے۔'' خان صاحب کی گہری طمانیت ان کی ہر حرکت، ہر عمل اور ہر ہر لفظ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے غسل لیا، قبرستان کی مٹی زدہ لباس تبدیل کیا اور لمبی تان کر پرسکون نیند سوئے۔

آج رات عرش کے تمام بند ٹوٹ گئے تھے۔ قل قل کرتے پرنالے بے تحاشا بہہ رہے تھے۔ آموں اور سنگتروں کے باغ، مصنوعی پہاڑیوں پر بچھے چنبیلی کے جھاڑوں والے لان اور دائیں، بائیں بنے پختہ صحنوں میں گھٹنوں، گھٹنوں پانی بھرا تھا۔ رابعہ آسمان سے چھاجوں برستے اور زمین پر منوں ٹھہرے پانیوں میں شرابور وسیع وعریض صحن میں مسلسل چکر لگا رہی تھی۔ یہ دسمبر کی یخ بستہ بارش تھی اور ہڈیوں میں جھنس رہی تھی۔ لیکن شاید وہ اس لمحے محسوسات کی دنیا سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ بلند و بالا فصیلوں والی ساکت حویلی کو تادیر دیکھتی رہی۔ آموں کے جھنڈ میں منہ کے بل گرتے قطروں کو ہتھیلیوں میں مسلتی رہی۔ زمین کے سینے پر سر رکھے سسکتے چنبیلی کے جھاڑوں کے قریب گھٹنوں میں سر دیئے تادیر بیٹھی رہی بارش کے قطرے اس کے بدن پر یوں پڑ رہے تھے جیسے اولے بج کر پھوٹ رہے ہوں۔ پھر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں شڑاپ شڑاپ چلتی ہوئی نادرہ کے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی تک وہ گلاس جس کی اندرونی سطح پر زہر کے قطرے جمے تھے وہیں میز پر پڑا تھا۔ اس نے گلاس اٹھالیا تادیر اس پر جمے قطروں کو گھورتی رہی اور پھر

گلاس لبوں سے لگالیا۔ گلاس کی سطح کا کڑوا ذائقہ اس کے منہ میں گھل گیا۔

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کی ماں اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے پیچھے اس کا باپ تھا جو دروازے میں ہی رک گیا۔ ثریا بیگم کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا۔ وہ مضمحل قدموں سے آگے بڑھیں اور گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔

''اسے پی جاؤ''

شہباز خان نے باہر اندھیرے میں گھورتے ہوئے حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ثریا بیگم کی سسکیاں سینے کے گنگ حصار میں گھٹنے لگیں۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''اماں''

اس کے لبوں سے بڑی اجنبی سی آواز نکلی۔ ثریا بیگم دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونسے دل کی اندرونی پرتوں میں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ''اسے کہو! چپ چاپ پی جائے۔''

شہباز خان ایک قدم بڑھا کر کمرے کے اندر آ گیا۔ ثریا بیگم نے گلاس میز پر رکھ دیا، اور زندگی میں پہلی بار دل کے ٹکڑوں کو آنسوؤں کے ساتھ بہانے لگیں۔ سیاہ مشروب سے لبالب گلاس میز پر دھرا تھا اور رابعہ ساکت و جامد کھڑی اپنی ماں کو حیرت سے تک رہی تھی۔ جیسے اس اجنبی عورت کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ''چپ کر بے وقوف عورت!'' شہباز خان نے ثریا بیگم کو ٹھوکر ماری۔ ''اسے کہہ کہ پی لے دیر نہ کرے۔''

ثریا بیگم دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ڈھ گئیں۔ پھر فرش پر ہاتھوں کے بل گھسٹتی ہوئی شہباز خان کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

''رحم......رحم......'' وہ شہباز خان کے قدموں پر سر پٹخ پٹخ کر گھٹی گھٹی چیخوں میں کرلانے لگیں۔ ان کے سینے میں چکی کے بھاری پاٹوں کے بیچ کچھ پسنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ شہباز خان نے زور سے ٹھوکر ماری تو وہ واپس دیوار سے جا لگیں۔ رابعہ نے گلاس میز پر سے اٹھا لیا۔ ثریا بیگم کی گھٹی گھٹی چیخیں تیز ہو گئیں، جیسے سینے کے گھاؤ میں ابال آ گیا ہو۔ وہ فرش پر گھسٹتی ہوئی رابعہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئیں۔ ''رابعہ!......! مجھے......معاف......معاف''

لفظ ان کے حلق میں پتھروں کی طرح اٹک رہے تھے۔ شہباز خان نے انہیں بازو سے پکڑ کر

پرے پھینک دیا۔ وہ اپنی چیخوں کو گلے میں گھونٹنے کی کوشش میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں۔
رابعہ نے ایک گھونٹ بھرا۔ پھر شہباز خان کے قریب آئی اور بڑے تحمل سے گلاس اس کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔
''بابا جان! تھوڑی سی چینی ملا دیں...... بہت کڑوا ہے۔ کہیں مجھے الٹی نہ ہو جائے۔''
ثریا بیگم کی چیخیں بلند ہو گئیں اور وہ فرش پر بے تحاشا ہاتھ مارنے اور لوٹنے لگیں۔
''پی جاؤ''
یہ جملہ بولتے ہوئے شہباز خان کی آواز لرزاں تھی۔ رابعہ نے اپنے نتھنوں کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے بند کر کے پکڑا اور پورا گلاس غناغٹ چڑھا گئی۔
''رابعہ...... رابعہ...... میری بچی!''
ثریا بیگم دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ ایک منہ زور طوفان تھا، جو سنگین بند نے روک رکھا تھا۔ زہر کے چند قطرے پیالے کے پیندے میں لرزاں رہ گئے۔ رابعہ نے انہیں انگلی کی پور سے اکٹھا کیا اور انگلی زبان پر رکھ دی۔ پھر وہ شہباز خان کے سامنے آ گئی۔
''بابا جان! ڈاکٹر یاور کو چھوڑ دیں، وہ بے گناہ ہے۔ جرم میرا تھا...... خدا کی قسم میرا تھا، بابا جان۔''
وہ شہباز خان کے قدموں پر اوندھی ہو گئی۔ اس کے اندر سے قیمہ سا کٹ کٹ کر نکلنے لگا۔ چہرے پر شدید اذیت ٹھہر گئی۔ ناک اور منہ سے خون یوں ابل پڑا، جیسے پانی کا بے آواز نلکا کھل گیا ہو...... تینوں معمر عورتیں ایک دوسرے کے پیچھے چھپتی اور لپٹتی دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ ثریا بیگم نے اسے تھام کر پلنگ پر لٹا دیا اور پلنگ کے پائے سے سر ٹکرا ٹکرا کر دھاڑیں مارنے لگیں۔ شہباز خان دو قدم بڑھا کر رابعہ کے پلنگ کے قریب آیا اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا جو بہت ہلکی چل رہی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر شہباز خان نے سختی سے پکڑ لیا۔ وہ تکیے پر ادھر ادھر سر پٹخنے لگی۔ اور منہ سے خون اور بوٹیوں کا ریلا بہہ نکلا۔ شہباز خان نے اس کے اوپر چادر ڈال دی اور ثریا بیگم کو بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ تینوں معمر عورتیں چیختی ہوئی واپس بھاگیں۔
''ہمیں مت مارو...... ہمیں مت مارو''۔ انہوں نے کمروں میں جا کر کنڈیاں چڑھا لیں اور

دروازوں سے لگ کر کرلانے لگیں۔

''ابھی چپ کر جاؤ......صبح ہونے میں تھوڑی دیر ہے پھر جی بھر کر رولینا'' شہباز خان نے ثریا بیگم کو بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹا وہ دیوار کے ساتھ ساتھ گھسٹتی ہوئی باہر نکل آئیں۔شہباز خان نے دروازے کی باہر سے کنڈی لگادی۔ثریا بیگم بند دروازے سے سر ٹکرا ٹکرا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں، شہباز خان نے اپنے کمرے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لڑکی کا جنازہ رات کو اٹھے گا۔''

رابعہ نے جھرجھری لی۔اس کے منہ میں زہر کی کڑواہٹ گھلی تھی۔اور زہر آلود گلاس لبوں سے لگا تھا۔کیا وہ زندہ تھی۔یا مردہ یا زندہ درگور۔تو کیا وہ اپنے انجام کو تصور کی آنکھ سے دیکھ چکی تھی۔اس نے ہٹا کر گلاس فرش پر پٹخ دیا چھوٹے چھوٹے ریزے ہر سو بکھر گئے۔بس اتنی سی ہمت۔بس گلاس کو پٹخنے کا حوصلہ درکار تھا۔

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔جس میں نادرہ اپنے بالوں میں سے جھانکتے چاندی کے تاروں کو دیکھا کرتی تھی۔وہ اپنے ایک ایک نقش ایک ایک تاثر جلد کے اندر چھپے مساموں تک کو بغور دیکھنے لگی۔جیسے پہلی بار خود کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔اس کے گیلے کپڑوں اور بالوں سے پانی کے قطرے گر گر کر فرش کو بھگو رہے تھے۔اس نے اپنا بھیگا ہوا دوپٹہ اتار کر پھینک دیا۔بھیگا لبادہ بدن پر چپک گیا تھا۔نیم تاریکی میں چھپی یہ خطرناک حد تک حسین لڑکی خود کو ہر زاویے سے گہری گہری نگاہوں سے جانچ رہی تھی جیسے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کر رہی ہو۔باہر حویلی کی رفیع الشان فصیلوں پر آسمان کھل کر رو چکا تھا۔ابتدائی تاریخوں کا چاند اپنی دودھیا چاندنی حویلی کی بلند فصیلوں پر بکھیر کر سو گیا تھا۔اور گہری تاریکی اس عظیم الشان عمارت سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی،ستاروں کے جال سے پھوٹتی روشنی آموں اور سنگتروں کے گھنے پیڑوں میں مدغم ہو گئی تھی۔باہر سردی بارشوں کے پانیوں میں جم گئی تھی اور رابعہ کی رگوں میں دوڑتے گرم خون کو ابال دے رہی تھی۔

اس نے چوپٹ کھلے دروازے میں کھڑی تینوں معمر عورتوں کو ہاتھ کے اشارے سے پرے ہٹنے کو کہا۔اور خود بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔اس کے پیچھے تینوں معمر عورتیں لپکیں وہ پچھلے قدموں گھوم کر کھڑی ہو گئی۔اسے واپس مڑتا دیکھ کر وہ آپس میں لپٹ کر گچھا سا ہو گئیں اور ایک دوسری کی بغلوں میں

منہ چھپانے لگیں۔

اس نے اپنے دل میں شدید قسم کا ممتا بھرا جذبہ ترحم محسوس کیا۔ بے آب و گیاہ خشک جزیرے، جن کے حصے کی بارشیں گمنام جزیروں پر برس چکی تھیں۔ لیکن اس کے حصے کی بارشیں ابھی برسنا باقی تھیں اور انہیں اسی کے جزیرے پر برسنا تھا۔ وہ سرعت سے واپس پلٹی اور حویلی کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔ تینوں معمر عورتیں اپنے جسموں اور ہاتھوں کو نوچنے اور کاٹنے لگیں۔ ان کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اور زبانیں دانتوں تلے آ کر کٹ گئی تھیں۔ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا اور بولی۔

''میرا جوڑا پیدا ہو چکا ہے اور میں اس جاگیر پر تھوک کر جا رہی ہوں اور آہنی در پار کر گئی۔''

تپسیا

زمیندار کے ڈیرے پر پنچایت جمی تھی۔ فریقین دلائل دیتے دیتے اور سنتے سنتے تھک چکے تھے لیکن کوئی تصفیہ عمل میں نہ آرہا تھا۔ حاضرین بحث و مباحثہ کرتے کرتے کسی اور ہی سمت نکل جاتے اور پھر خالی الذہن ہوکر چپ ہوجاتے ایسے ہی ایک وقفے میں جب مجمع پر ایک طویل سکوت طاری تھا۔ اور حقوں کی گڑگڑاہٹ طویل تر ہوگئی تھی تو مائی جنت اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اس کے کپڑوں سے اڑ کر دھول حاضرین کے دانتوں تلے کرکرا گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر چودھری صاحب کے سامنے عرض گزاری۔

''چودھری جی! انصاف کریں، مجھ بیوہ کے ساتھ یہ ظلم ہے، میرے یتیم بچے کے ساتھ ظلم ہے۔''

مجمع میں بیٹھے تماشائیوں میں سے اکثر کے دل پسیج گئے کوئی کوئی آواز ابھری۔

''سچ ہے...... سچ''

مائی نے ہمدردی جتانے والوں کی طرف ایک رحم طلب نگاہ ڈالی اور آواز میں مزید رقت پیدا کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''میں نے کیا برا کیا ہے ان ظالموں کے ساتھ؟۔ آپ پوچھیں، آپ مائی باپ ہیں آپ ان سے پوچھیں۔ وٹہ کیا ہے، اپنی پریوں کی سی بیٹی بیاہ کردی ہے جو اب چار بچوں کی ماں ہے۔'' مائی نے حلق میں خشک تھوک یوں نگلا، جیسے کانٹے بھرے ہوں۔'' ان بے اعتباروں پر اعتبار کیا۔ اپنے بیٹے کا نکاح کیا کہ

بچی بالغ ہوگی تو رخصتی ہو جائے گی۔اب جبکہ لڑکی جوان ہے یہ مکر گئے ہیں اپنے قول سے۔''

مائی نے مخالف فریق کی طرف نفرت انگیز نظروں سے دیکھا۔ اور حاضرین پر انصاف طلب نگاہیں ڈالیں۔کئی لوگوں نے حقے کی نئے ہونٹوں سے لگا کر اثبات میں سر ہلایا اور کئی ایک نے نئے منہ سے نکال کر کہا۔

''حق پر ہے مائی! حق پر ہے بنا شک'' اور پھر تمبا کو کی مخصوص کھانسی کھانسنے لگے۔

''چودھری صاحب نے دوسرے فریق کے سربراہ سے کہا کیوں بھئی غلام محمد! بول اب کیا بولتا ہے۔ مائی اپنی بات میں سولہ آنے کھری ہے۔ بیوہ عورت اور یتیم بچے سے ہیرا پھیری بڑا پاپ ہے۔''

''حق ہے حق ہے'' تماشائیوں نے منہ سے حقے کی نئے اگل کر پھر دہائی مچائی۔

''غلام محمد سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔اس کی سیاہ کھردری جلد والے چہرے پر پریشانی اور الجھن طاری تھی، مردوں کی اس بھری پنچایت میں مائی واحد عورت تھی۔تمام مرد لال پائیوں والی سوت سے بنی چارپائیوں پر بیٹھے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ مائی زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔تبھی ڈیرے میں گھس آنے والی بکری اس کا میلا کچیلا پلو چبانے لگی۔اوئے کرمو! چودھری صاحب نے نوکر کو آواز دی۔

''اوئے کہاں مر گیا ہے۔اس ماں کو باہر نکال۔''

کرمو بھاگتا ہوا آیا اور بکری کو ہانک کر جانوروں کے باڑے میں لے گیا جس میں بھرے چارے، کھلی، سانی اور گوبر کی بوڈیرے میں در آئی تھی۔ مائی عدم تو جہی سے گھبرا کر پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔میلی چیکٹ سفید بالوں کی لٹیں میل خوری چادر میں سے مردہ چھپکلیوں کی مانند جھول رہی تھیں اور چہرے پر مصائب زمانہ اور جفاکش زندگی کے آثار جھریوں کے آڑے ترچھے جال کی صورت میں ہویدا تھے۔

''چودھری جی! مجھے ایک بازو دلائیں...... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میری بیٹی پر بھی قابض ہیں اور اپنی لڑکی بھی نہیں دیتے۔''

مائی نے خالی خالی نظروں سے باہر سنسان پڑی سڑک کو دیکھا، جس پر دھول کے غبار محوِ سفر تھے۔

چودھری صاحب نے گاؤ تکیے پر پہلو بدلا اور حقے کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کہا۔

''بات درست ہے...... کیوں بھئی غلا ے! مائی کی بیٹی کو اس کے گھر بٹھاؤ گے یا اپنی کو رخصت

کرو گے؟ دونوں پر بیک وقت قابض نہیں رہ سکتے تم...... ہاں جلدی فیصلہ کرو۔''

''چودھری جی! میرا گھر نہ اجاڑیں، میرے چھوٹے بچے رل جائیں گے۔''

مائی کا داماد کھڑا ہوا اور پورے مجمع کو انصاف طلب نظروں سے دیکھا۔ لیکن اس کی رقت آمیز فریاد کا اثر بہت کم حاضرین پر مرتب ہوا۔

''تو میرا بیٹا اجڑا رہے...... خانماں برباد رہے''۔ مائی تیورا کر کھڑی ہوئی۔''اگر اس کا گھر نہیں بسے گا تو تیرا بھی نہیں بسنے دوں گی ہاں'' پھر جیسے جھٹکا کھا کر بیٹھ گئی۔

پیپل اور نیم کے جھنڈ کے پاس نومبر کی خوشگوار دھوپ میں جہاں پہ پنچایت جمی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بہت سے سبز پتے سارے صحن میں پھیل گئے۔ کئی ایک سفید سفید پگڑیوں میں الجھ گئے اور کچھ چلموں میں گر کر سلگنے لگے۔

''اوئے شیرو!'' چودھری صاحب نے غصیلے لہجے میں آواز دی۔''

''جی چودھری جی'' دیکھ نہیں رہا چلموں میں پتے گر رہے ہیں، ملازم سلگتے پتے اٹھانے لگا۔

''بول اوئے غلامے! عورت کے پیچھے لگ کر قول ہارتا ہے۔''

''بیوہ عورت اور یتیم بچے کے ساتھ یہ ظلم میں اپنی بستی میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔'' چودھری صاحب نے ستائش طلب نگاہوں سے حاضرین کو دیکھا''

''واہ چودھری جی واہ......'' مجال نہیں کہ چیل مرغی کا بچہ اٹھالے اس بستی سے۔'' انصاف ہو تو چوہدری جی جیسا'' ایک شور اٹھا اور بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ پنچایت کئی گھنٹے جاری رہی اور بالآخر غلامے کے بڑے بھائی دین محمد نے کہا۔

''ٹھیک ہے چودھری جی! ہم اسے باز و دیتے ہیں۔ اس جمعہ کو برات لے کر آ جائے۔''

چودھری جی نے گرجدار آواز میں کہا۔'' دیکھ اوئے دین محمد! کوئی گڑ بڑ ہوئی تو جان رکھ، مائی میری رعیت ہے۔''

دین محمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا'' مائی باپ! یہ دین محمد کا قول ہے مردوں کی پنچایت میں مرد کا قول ہے، اس جمعے باز وان کے حوالے ہوگا۔''

لڑکی کا باپ غلام محمد تو خاموش رہا البتہ حاضرین نے دین محمد کی بات کا یقین کیا اور اس فیصلہ پر

ستائشی کلمات ادا کیے پھر پنچایت منتشر ہو گئی۔ مائی گھر پہنچتے پہنچتے ہر شخص، ہر اینٹ روڑے کو یہ نوید سنا چکی تھی کہ اس جمعے وہ بیٹے کو بیاہنے جا رہی ہے۔

گھر پہنچی تو کچے کوٹھے کے باہر اس کا بیٹا سانول آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر کبوتروں کو کھلا رہا تھا۔

''چھوڑ ان کبوتروں کو'' مائی نے اس کی کمر پر دو ہتڑ جمائے۔ ''اگلے جمعے تیرا بیاہ ہے۔ کام پر جایا کر باقاعدگی سے، ایک منہ اور شامل ہو جائے گا تو کہاں سے لاؤں گی میں اتنے جیوں کے لئے۔''

لڑکا بے تاثر چہرہ لیے اپنے کام میں مصروف رہا جیسے کچھ نہ سن رہا ہو، دیوار سے سر نکال کر رضیہ نے پوچھا۔ ''ماسی کیا ہوا'' ''ارے بٹی آج کیا دن ہے'' جنت نے دماغ پر زور دیتے ہوئے اسی سے سوال کر ڈالا۔ سوموار ہے نا!۔

''ہاں ماسی! رضیہ نے سانول کو دیکھا'' پرکشش نقوش، لمبے قد اور کھلے ہاتھ، پاؤں والا لڑکا جو تمام تر توجہ سے کبوتروں کو دانہ کھلا رہا تھا...... ''ہوں'' رضیہ نے ناک سکیڑی ''کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں آنکھ اٹھا کر لاٹ صاحب...... احمق کہیں کا!''

''منگل، بدھ اور جمعرات'' مائی نے انگلیوں کی پوروں پر دن گنے ''دو تین دن...... ہاں ابھی تو نائن کی طرف بھی جانا ہے۔ بھیجوں گی اسے سارے گاؤں میں بلاوا دینے کے لئے۔''

''کیوں ماسی تیرا بیاہ ہو رہا ہے کیا۔''

''ہے کم ذات!'' مائی نے چمڑے کا سوکھا ہوا جوتا اٹھا کر اس کی طرف اچھالا۔ لڑکی قہقہہ لگا کر دیوار سے غوطہ کھا گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے پھر سر نکال کر کھڑی ہو گئی۔

''کون ہے مائی کا لال جو جنت مائی کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے۔ تیری عمر کی ہوں گی جب بیوہ ہوئی۔ یہ دونوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن جہاں بھی رہی۔ محنت مزدوری کی مردوں کی طرح کمتی! پر رہی عورتوں کی طرح...... چھنالوں کی طرح نہیں، پوچھ لے سارا گاؤں گواہ ہے۔''

''پھر بات کیا ہے؟'' رضیہ نے اپنے ہمسائے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''بیاہنے جا رہی ہوں اپنے سانول کو جمعے کے روز......''

''اس جمعے''.....لڑکیوں نے بیک وقت کہا، پھر بیک وقت بڑے ہی میکانکی انداز میں ان کے حلق میں تلخ ذائقہ سا گھل گیا۔

''ہاں ہاں اسی جمعے.....''ابھی سو کام پڑے ہیں۔ میں بھی کملی باتوں میں لگ گئی ہوں۔ ابھی کوئی ٹلا ٹا کی دیکھنا ہے۔ آٹے دانے کا بندوبست کرنا ہے۔ تائن کی طرف جانا ہے..... لو میں کوئی فارغ تھوڑی ہوں؟''

وہ تیز تیز قدموں سے گلی مڑ گئی۔ لڑکیاں تادیر دیواروں سے سر نکالے اس احمق لڑکے کو گھورتی رہیں جو کبوتروں کو چوگ کھلانے میں اس طرح مصروف تھا جیسے اس سے زیادہ دلچسپ کام دنیا میں کوئی دوسرا نہ ہو۔

مائی کے بیٹے کی برات بیل گاڑی پر روانہ ہوئی تو ایک بڑا ہجوم ہمراہ ہولیا۔ گاؤں بھر کے بچے، لڑکیاں اور چھوٹے چھوٹے روتے دھوتے بچوں کو کچھڑ اٹھائے عورتیں..... یہ سارا ہجوم دھول کے غبار میں لپٹا بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ رواں تھا۔ جس پر دولہا سنہری تاروں والا سہرا سجائے بیٹھا تھا۔ جس کے رو پہلے سہرے پر دھول کی تہ چڑھ گئی تھی اور مائی گلا پھاڑ پھاڑ کر سہرے کے گیت گا رہی تھی۔ فاصلے پر دیکھنے سے یہ سب کچھ آندھی کا ایک متحرک بگولا بجھائی دیتا تھا۔ تقریباً چھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دھول کے بادلوں میں لپٹی براتیوں سے بھری گاڑی جب دلہن کے گھر پہنچی تو وہاں برات کے استقبال کا قطعاً کوئی انتظام نہ تھا۔ اور جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لڑکی کی ماں اسے لے کر کہیں غائب ہو چکی ہے اور یہ کہ اب برات کو دلہن کے بغیر واپس جانا پڑے گا۔

مائی جنت دھول کو گلے میں سے کھنکار کھنکار کر تھوکتی ہوئی، ہجوم کو بگولے کی مانند چیرتی ہوئی اندر گھس گئی دولہا چہرے پر سہرا لٹکائے بیل گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ اور ساتھ آئے براتی جو رنگ برنگے تہمدوں اور سفید براق کرتوں میں ملبوس تھے اور جن کے کانوں اور پلکوں پر دھول جمی تھی اس صورت حال سے محظوظ ہونے لگے کچھ درختوں کے تنوں پر چڑھ بیٹھے۔ کچھ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے اور اپنے شناساؤں کو تلاش کرنے لگے۔ بیل چارے کی تلاش میں مٹی کو سونگھنے اور سر جھٹکنے لگے۔

گاؤں کی عورتوں اور بچوں تک جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے دھاوا بول دیا۔ عورتیں سہرا اٹھا اٹھا کر دولھے کو دیکھتیں، ستائشی جملے ادا کرتیں اور دبی دبی ہنسی ہنستیں ایک دوسرے کے چٹکیاں بھرتیں۔

ڈولھا ہر بار سہرے کو ہموار کرتا اور منہ پر رومال رکھ کر اگلے ملاحظے کے لئے منتظر بیٹھ جاتا۔

اندر کوٹھے میں دین محمد شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ جب مائی نے جا کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''بول اوئے بے ایمان! تو نے تو مردوں کی پنچایت میں مرد کا قول دیا تھا۔ بتا میری بہو کدھر ہے۔'' وہ مائی کی آنکھوں میں مترشح سنگین عزائم اور لہجے کی درشتی سے تھرا گیا۔

''مجھے بھی ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ لڑکی غائب ہے۔'' دین محمد نے اپنے گریبان کو چھوڑانے کی قطعاً کوشش نہیں کی اور اپنے آپ کو مائی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، مائی جنت پر ایک ہذیانی اور ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس نے دین محمد کے نویں نکور ململ کے کرتے کا گریبان لیر لیر کر ڈالا۔ اس کے چہرے کو نوچ ڈالا۔ مائی کی میلی چیکٹ بالوں کی لٹیں جو بڑے عرصے بعد آج دھوئی اور تیل سے چپڑی گئی تھیں۔ سفید براق ململ کے دوپٹے میں سے برگد کی جڑوں کی مانند لٹک رہی تھیں اور آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

''دین محمد! میں مر جاؤں گی، جان دے دوں گی، مجھے کچل ڈالو، دفن کر دو لیکن خالی ہاتھ نہ جاؤں گی۔ مجھے میری بہو دو دین محمد!'' وہ دین محمد کو احتسابی انداز سے جھنجھوڑتی، بھنجھوڑتی ہوئی زمین پر گھٹنے ٹیک کر زار و قطار رونے لگی۔ پھر وہ ہجوم کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو یوں چپ تھا جیسے کسی نے فائر داغ دیا ہو اچانک۔

''لوگو انصاف کرو...... مجھ بیوہ کے ساتھ انصاف کرو۔''

اس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی ہجوم میں ازلی اور فطری منصفانہ جذبات ابھر آئے اور انہوں نے دین محمد کی طرف اجتماعی نفرت سے دیکھا۔ دین محمد نے ایک آبرومندانہ نگاہ پورے مجمع پر ڈالی اور حتمی انداز میں بولا۔

''یہ برات خالی نہیں جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی گردن میں آپ ہی آپ کلف سا لگ گیا۔ ''مائی کو باز و ضرور ملے گا۔'' دین محمد نے پگڑی کو سر پر درست کیا، اور مائی کی دست برد سے بریدہ گریباں کو درست کرنے کی ناکام کوشش کی جو کسی جھنڈے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

پورا مجمع دم بخود تھا، وہ جانتے تھے کہ جس لڑکی سے لڑکے کا نکاح ہو چکا ہے وہ غائب ہے۔ پھر...... کون سا باز و؟...... ہجوم کو تجسس نے آخری انتہا پر پہنچا کر گنگ کر دیا تھا۔

''میں اپنی بیٹی دوں گا، مائی کے بیٹے کو'' دین محمد نے سینے پر ہاتھ مارا اور حاضرین کی طرف داد

طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''تمہاری بیٹی جو غلام محمد کی بہو ہے اور کچھ عرصہ پہلے بیوہ ہو چکی ہے۔اور نو بچوں کی ماں ہے......؟''ایک براتی نے درخت کے تنے سے چھلانگ لگائی اور دین محمد کے بالمقابل آ کر حیرت سے استفسار کیا۔

''ہاں......میں مرد ہوں اور مرد قول ہارا نہیں کرتے ،میرا بھائی بے غیرت ہے۔لیکن میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا'' دین محمد نے دو تین بار اپنے سینے کو ٹھونکا۔''واہ......واہ! آفرین ہے۔مرد ہو تو ایسا......قول ہو تو ایسا''

مجمع نے دہائی مچائی۔مائی تیورا کر اٹھی۔پسینہ کن کھجوروں کی طرح اس کے پیٹ سے رینگتا ہوا ٹانگوں پر پھسل گیا۔

''لیکن میرا بیٹا کنوارہ،اٹھارہواں برس لگا ہے اسے ابھی''

مجمع جو ابھی تک دین محمد کے قول نہ ہارنے پر تحسین وستائش کے ڈونگرے برسا رہا تھا یوں چپ ہو گیا جیسے کوئی اچانک دھماکہ سا ہو گیا ہو۔کئی چہروں پر بڑے ناگوار سے تاثرات ابھرے جیسے کسی کا انتہائی قیمتی تحفہ کوئی حقارت سے اٹھا کر پھینک دے۔مائی کا بھائی اسے بازو سے کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور سمجھایا۔

''بے وقوف مت بن عورت ذات! تیری تو عقل ایڑی میں ہے۔یہ اس خزانے کی چابی ہے جس کی تجھے تلاش ہے۔غلام محمد اپنی بہو کبھی نہ چھوڑے گا جس کے چھوٹے چھوٹے نو بچے ہیں بالآخر وہ بیٹی کا ہاتھ تجھے دے گا اور بہو لے جائے گا دین محمد کی بات رکھ لے۔''

بات مائی کی سمجھ میں آ گئی۔اب پہلی بار لوگوں کو دولہے کا خیال آیا جو سہرا سنبھالے ابھی تک بیل گاڑی کے تختوں پر جما بیٹھا تھا۔اسے اتار کر چار پائی پر بٹھایا گیا اور عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر بیاہ کے گیت گانے لگیں،قریبی کھیت میں کپاس چنتی ہوئی زینب کو گھیر لایا گیا،جس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر کپاس کی کھوکھڑیاں لگنے سے خراشیں پیچیدہ نقشوں کی طرح کھدی تھیں۔اور جانوروں کے مسّوں کے سے کھردرے چہرے پر حیرت ٹھہر گئی تھی۔زینب کا بیوگی کا لباس اتار اسے نہلایا دھلایا جانے لگا۔مہینوں سے میل میں اٹے بال اور جسم مل مل کر دھویا گیا۔بیسن اور ہلدی گھول کر ابٹن ملا گیا،جس کی بو کنواریوں

کے نتھنوں میں گھس کر سر درد کا باعث بن گئی۔ پھر مائی کا لایا ہوا لال جوڑا پہنا، سستے بازاری زیورات سجا زینب کو دلہن بنا دیا گیا عورتیں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔

ہوسانولی

ہوسانولی تیرے مغر پراندا...... بھلا ہوسانولی رب راجھے نوں آندا

گیت کی پر اثر لے اور پوشیدہ مفہوم کنواریوں کے سینوں میں بھانبھڑ بھڑ کا گئے۔ اور بیاہیوں کے نینوں میں یادوں کی برات سی اتر آئی۔

ہوسانولی

ہوسانولی تیرے بوہے تے جنڈ اے، بھلا ہوسانولی۔

رانجھا مست ملنگ اے

ہوسانولی تیرے بوہے تے کیڑیاں

بھلا ہوسانولی تیریاں ہردم چھیڑیاں

زینب کے بچوں کو جب حقائق کا علم ہوا تو انہوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور پرسوز گیت کا تاثر کرب انگیز ہو گیا، زینب کی بڑی لڑکی جو سانول ہی کی ہم عمر تھی۔ اپنی ماں سے لپٹ کر بہت روئی اور رقت آمیز آواز میں کہا۔

''ابھی تو باپ کی جدائی کا غم ہی ہم نہ بھولے تھے کہ اب تو بھی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے...... نہ جا اماں! نہ جا''

رقیق القلب عورتیں آنسو بھر لائیں، اور گیت گانے والیوں کے سر رقت آمیز ہو گئے لیکن جب لڑکی کی آہ و بکا کا اثر فیصلے پر مطلق نہ ہوا تو وہ اونچے اونچے سروں میں بین کرنے لگی، اور باقی آٹھوں بچے بہن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

پھر جب دلہن کی گاڑی روانہ ہوئی تو بڑی لڑکی آٹھوں بچوں کو سنبھالے پیچھے پیچھے بھاگی۔

''جا...... جا منہ کالا کر بے حیا عورت! ہمارے باپ کی قبر تو ٹھنڈی ہونے دیتی'' لڑکی نے پاؤں سے جوتا کھینچ کر مارا جو گاڑی کے ڈنڈوں سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ ''جا گھبرو کے ساتھ چلی جا، بچوں کو روتا چھوڑ کر منہ کالی۔'' اس نے دوسرا جوتا اچھال کر پھینکا جو دلہن کے گھونگھٹ میں اٹک گیا۔ جسے ایک

براتی عورت نے باہر نکال کر پھینکا۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ دھول میں گم ہو گئی۔ اور بچوں کی چیخیں اور کوسنے دور کہیں فاصلے پر دب گئے۔

برات جب گاؤں پہنچی تو سورج مغرب کے بسیط عنابی افق میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے درود شریف پڑھنے کی آوازیں سارے گاؤں میں پھیلی تھیں۔ سڑکوں پر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور چرواہے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دو، دو من روئی کے گٹھڑ سروں پر اٹھائے عورتوں کی ٹیڑھی ہوتی پنڈلیاں بھربھری مٹی میں یوں دھنس رہی تھیں جیسے وہ کچی برف پر چل رہی ہوں۔ پلکیں، نتھنے، حلق، کان، دانت، بال اور کپڑے دھول میں یوں اٹے ہوئے تھے جیسے انسانوں اور جانوروں پر مشتمل یہ مخلوق دن بھر کلر اٹھی مٹی میں لوٹیں لگا کر آرہی ہو۔

گھر پہنچ کر جب بیل گاڑی کی چولوں سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہونے لگیں، اور دولہا دلہن مٹی کے باوے معلوم ہونے لگے۔

تو مائی جنت نے بسم اللہ پڑھ کر دلہن کو گاڑی سے اتار کر کوٹھے میں بٹھایا اور خود دودھ کا گلاس لینے بھاگی۔

باتھو اور سرسوں کے ساگ کی مہک میں لپٹی گاؤں کی عورتیں دلہن دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑیں، مائی کا کوٹھا لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کے قہقہوں سے منہ زور چشمے کی مانند ابل رہا تھا، عورتیں دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتیں، اور وہ شرما کر اسے مزید نیچے گرا لیتی۔

رضیہ بھی ایک ہی شیطان تھی۔ تل ہی گئی کہ گھونگھٹ اٹھا کر ہی دم لے گی۔ اس نے دونوں گھٹنے زمین پر جمائے اور دلہن کا دوپٹہ چہرے سے کھینچا، متضاد سمتوں میں زور لگانے سے دونوں جھٹکا کھا کر عورتوں پر گریں، اور دوپٹہ رضیہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا......

ادھ کھچڑی بال، چہرہ جھریوں کے جال میں ستا ہوا، بھدے نقوش پر سستے بازاری زیورات ٹنگے ہوئے جیسے کوئلے کی کان میں پیتل کے برتن سجے ہوں، عورتوں کے قہقہوں سے ببول پر جھولتے بیا کے گھونسلے لرزنے لگے۔ رضیہ نے ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ کر کہا۔

''مائی جنت!......اے ماسی جنت! اب تو بھی شادی کر ہی ڈال تجھے بھی کوئی گھبرو مل ہی جائے گا تو تو زیادہ جوان اور خوبصورت ہے۔'' اس پر قہقہے بے آواز ہو گئے۔

مائی جنت نے اس کی کمر پر دو ہتھڑ جمائے۔

''کھچری! باتیں بناتی ہے۔''

پھر جب عورتیں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئیں تو گھروں کو روانہ ہوئیں باہر کہرا ٹیوب ویل کے نل اور نہر کے پانی میں منجمد ہو چکا تھا۔ اور جانوروں کے باڑوں کو سرکنڈوں کے چھپروں سے بند کر دیا گیا تھا۔ سنسان پڑی گلیوں میں اکادکا کسان چارخانہ کھیسوں کی بکل مارے آ جا رہے تھے۔ سانول باہر چارپائی پر بیٹھا آسمان پر چھائے نیالے غبار کو گھور رہا تھا۔ جیسے کسی المیہ داستان کا بدنصیب ہیرو۔ جسے قانون قدرت اور منطقی تلازموں نے تباہ کر دیا ہو۔ اسے دیکھ کر عورتوں نے ایک دوسری کو ٹہوکے دیئے۔ اور چٹکیاں بھریں، رضیہ نے قریب سے گزرتے ہوئے لہجے میں طنز کے سارے تیر بھر کر کہا۔

''مبارک ہو سانول! شادی مبارک ہو۔''

عورتیں جب سنسان گلی میں گوبر کے ڈھیروں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئیں آج کے واقعہ پر تبادلہ خیالات کرتی ہوئی دبی دبی ہنسی ہنس رہی تھیں، تو پیچھے سے مائی آئی اور رضیہ کی کمر میں ٹہوکا دے کر بولی۔ ''کھچری ہنستی ہے۔'' اور خود اپنی ضبط کی ہوئی ہنسی منہ میں پلو دے کر یوں اگل دی جیسے سوڈے کی بوتل کا اچانک ڈھکنا اٹھ جائے۔ پھر پانی میں پھوٹتے حباب کی سی ہنسی میں بولی۔

''ہمیشہ کے لئے تھوڑی لے آئی ہوں..... چھوٹے چھوٹے بچے چھڑوا کر لائی ہوں، دیکھنا اب کیسے بھاگا آتا ہے بیٹی کا بازو لیے۔''

''بیٹی کا بازو۔؟'' سرداراں ماچھن نے شہادت کی انگلی ٹیڑھی کر کے ناک پر رکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''اری وہی اپنی کوثر پروین..... میری اصلی بہو۔''

رضیہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا ''پر ماسی مجھے ایک ڈر ہے اسے دیکھ کر کہیں تیرا دل بھی نہ للچا آئے نئی شادی پر.....''

''دھت تیرے.....'' مائی نے اسے دھکا دیا۔ عورتیں ہنستی ہوئی درختوں میں کٹی یخ تاریکی میں گم ہو گئیں۔

اگلے روز عورتیں اس انوکھی دلہن کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑیں، مائی کے کوٹھے کا کچا فرش اکھڑ گیا

اور صحن میں لگی دھریک کے ٹہنے ٹوٹ کر جھولنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں خوبصورت سے خوبصورت دلہن کو دیکھنے کے لئے اتنی عورتیں جمع نہ ہوئی تھیں جتنی زینب کو دیکھنے کے لئے آئی تھیں، جو اندر ہی اندر خود کو کلی سے بھی زیادہ سبک، تر و تازہ اور معطر محسوس کر رہی تھی۔

عورتیں جملے اچھالتی قہقہے لگاتی باہر نکلتیں تو نوعمر خوش شکل دولہے پر نظر پڑتی۔ جس کے چہرے پر عجیب سی حسرت برس رہی تھی اور جو کبوتروں کو دانہ کھلانے کے بہانے اپنا سر گھٹنوں تک لے آیا تھا عورتوں کے منہ سے مشترکہ طور پر چچ چچ کی افسوسناک آوازیں برآمد ہوتیں، جیسے ان کے اندر کوئی چھوٹی موٹی موت ہی تو واقع ہوگئی ہو۔ اور وہ گھروں میں روتے اور گندگی میں لوٹ پوٹ بچوں اور بھو کے بیٹھے مردوں سے پٹنے کا تصور لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتیں۔ مائی جنت نے دلہن کے لئے سوجی کا حلوہ بنایا اور نوالہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''تو ان عورتوں کی باتوں کا برا نہ ماننا ان کملیوں کا کیا ہے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہیں، تو تو میری بچی ہے اس گھر کا چانن ہے۔ آنگن کا سنگھار ہے۔'' مائی کو یہ سوچ کر ہنسی آگئی کہ دیہاتی عورتیں اپنی بھینس کے متعلق بھی یہی کچھ کہتی ہیں۔

زینب ایک ادائے دلربانہ سے اس کے ہاتھ سے نوالے لے کر کھانے لگی۔ اور باہر بیٹھے اپنے آدمی کو کنکھیوں سے دیکھا، جو ایک ہی دن میں اس کے اندر پھیلے اجاڑ میں باد بہاری کی صورت تحلیل ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا اپنا مرد تو اپنا ہی ہوتا ہے نا۔ جو ہر شے حتیٰ کہ اولاد تک کو بھلا دیتا ہے۔ زینب کو باہر جھانکتے دیکھ کر مائی اٹھ کر باہر آ گئی۔ اور سانول کے کان کے قریب منہ لا کر بولی۔

''تو ذرا اس سے پیار سے بات کیا کرتا کہ ٹکی رہے آخر بچوں والی ہے پیچھے کی تانگ ہوگی یہ نہ ہو کہ بچوں کی ماری بھاگ جائے۔ جب تک کوثر پروین نہیں ملتی ہمیں اسے یہاں خوش رکھنا ہے۔''

سانول نے اثبات میں سر ہلایا، پھر دونوں ماں بیٹے نے ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا۔ جیسے اپنی سکیم کی کامیابی پر مبارک باد دے رہے ہوں۔

مائی جنت بیٹے کا ہاتھ پکڑے کوٹھے میں داخل ہوئی۔ دلہن گھونگھٹ کے اندر کسمسائی اور گھونگھٹ اور لمبا گرا دیا۔ مائی نے دولہے کو دلہن کے قریب بٹھاتے ہوئے کہا،

''لے اب اپنے سائیں کو حلوہ کھلا۔''

''دلہن نے حلوے والا کٹورہ دولہے کے سامنے کیا اور ایک ادائے دلربانہ سے مسکراہٹ پیش

کی جو اس کے سیاہ کھردرے چہرے پر کھدی جھریوں کو سنگین تر بنا گئی۔

''اماں'' سانول کے اندر ایک بے آواز چیخ سی ابھری۔ اور اس نے اس آسیب کے سائے میں ماں کی طرف دیکھا، جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''چڑھ جا بیٹا سولی پر...... بھگوان بھلی کرے گا۔''

اور وہ اس چوہے دان میں چپکا پڑا رہا، جس میں کالی جنگلی بلی گھس آئی تھی......

زینب نے دوسرے ہی دن سے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ وہ صبح سویرے بیدار ہو کر دن بھر کے پرمشقت کاموں پر یوں نگاہ ڈالتی جیسے یہ تازہ خون کی بوتلیں ہیں جو اس کے سبک وجود میں انڈیلی جائیں گی۔ وہ گوبر اور جانوروں کے پیشاب سے اٹا صحن یوں صاف کرتی جیسے گلاب کی کلیاں لچکیلی انگلیوں سے چن رہی ہو۔ دودھ بلوتی، آٹا گوندھ کر تنور پر روٹیاں پکاتی، اور کمال سلیقے سے چنگیر میں رکھ کر سانول کو پیش کرتی۔ تقریباً روز ہی چولہا لیپتی جانوروں کے لئے گھاس کھود کر لاتی، انہیں نہلاتی۔ اور جب سانول کام سے لوٹتا تو اسے چمکتا ہوا صاف ستھرا گھر اور مزے دار پکا ہوا کھانا ملتا۔ وہ پرات میں پانی لے کر اس کے پاؤں دھوتی اور کئی بار چپکے سے وہ پانی پی بھی جاتی۔ یوں کہ سانول بھی دیکھ لے۔ اسے گندا پانی پیتے دیکھ کر وہ بیزاری سے منہ پھیر لیتا۔ لیکن ستی ساوتری چتا کے چکر لگائے نہ تھکتی تھی، اور چتا کی آنچ اسے کیسے کیسے نہ نکھار رہی تھی۔

ہمسائیاں دیواروں سے جھانک جھانک کر سارے چونچلے دیکھتیں تو پہروں کلیجہ جلاتیں، سانول سو رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی پلو سے مکھیاں جھل رہی ہے۔ سانول کام پر جا رہا ہے اور وہ آنچل سے جوتا صاف کر کے پہنا رہی ہے، کھانا لا رہی ہے ڈھک کے ہمسائیوں کی نظر سے بچا کے۔ یہی تو آنکھوں سے نکالتی ہیں اس دن جو سانول ماہی کو الٹیاں لگی تھیں اور اس نے ساری قے اپنے دامن میں سمیٹ لی تھی۔ اسی رضیہ چڑیل کی تو نظر لگی تھی۔ سانول نے پانی مانگا ہے تو وہ دودھ کے کٹورے میں مصری کی ڈلی انگلی سے گھولتی ہوئی لا رہی ہے اور چہرے پر عجیب سی مسکان ہے پتہ نہیں کیا تصور کر رہی ہے، جب جھانکنے والی لڑکیوں کی جلن حد سے بڑھ جاتی تو پھر قہقہوں کے چھینٹے مار کر سرد کرتیں۔

اس دن سانول شہر جا رہا تھا۔ اس نے صبح سویرے دودھ بلو کر اس کے لئے لسی بنائی۔ پراٹھے پکائے اور جب وہ نیلی لنگی اور بوسکی کا کرتا پہن کر روانہ ہونے لگا تو وہ سفید پونے میں بندھی روٹی کی پوٹلی ہاتھ میں لیے بھاگ کر اس کے سامنے آ گئی اور دوپٹے کے پلو کو موڑتے ہوئے بولی۔

''میرے لئے شہر سے کیا لاؤ گے؟'' سانول نے بےزاری سے منہ پھیر لیا۔ پہلا وار ہی اوچھا پڑا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دیوار سے جھانکتی رضیہ کو دیکھ کر اپنے ڈھیتے ارادوں کو مضبوط کر کے اس کے اور قریب آ گئی۔

''سانول ماہی! دیکھ میرے لئے پراندہ لانا موتیوں والا جیسا...... جیسا۔'' سانول گٹھڑی میں اپنی ضرورت کی چیزیں رکھتا رہا۔ جیسے اس کی بات مطلق نہ سنی ہو، پانسہ پھر غلط پڑا تھا۔ اس نے رضیہ کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا۔ جس کے چہرے پر تمسخر پھیلا تھا۔ اور گھبرا کر پھر غلط چال چلی۔ سانول کے کالر سے کھیلتے ہوئے دلار سے بولی۔

''میں اپنے لئے تھوڑی کہہ رہی ہوں، سب تیرے دکھانے کے لئے ہی تو ہے یہ سارا سنگھار۔''
سانول نے ہاتھ بڑھا کر کھانے والی پوٹلی پکڑنا چاہی لیکن اس نے پوٹلی دور کر لی۔ سانول نے اس کی انگلیوں سے اپنا کالر سختی سے چھڑایا اور زور سے داہنا ہاتھ دیا، وہ لڑھکتی ہوئی بھینس کی ناند میں جا پڑی۔ اور کھانے کی پوٹلی گوبر میں دھنس گئی۔ اس نے رضیہ کی طرف دیکھا جو دبی دبی ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ تیورا کر انا کی آخری سولی پر چڑھ گئی۔ اور بھاگ کر اس کا راستہ روکا۔

''تیرا یہ ستم بھی میرے لئے پیار سے کم نہیں یہ کیا کم ہے کہ تو نے مجھے اس قابل تو سمجھا۔ میں تجھ سے زیادہ نہیں مانگتی۔ تھوڑا سا چوگا دے دیا کر بس زندہ رہنے جوگا۔ اپنے کبوتروں کو بھی تو دیتا ہے۔ مجھے بھی اپنی......'' سانول اس کے پہلو سے نکل بےکواڑ کے در سے باہر چلا گیا۔ وہ چھوٹی سی دیوار کے ادھر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ کھرلی میں گرنے سے اس کے پہلو میں لکڑی کا تختہ بری طرح چبھا تھا۔ لیکن یہ چوٹ بھی تو سانول ماہی کی دی ہوئی ہے نا!۔ جیسے پھولوں بھری چھمک چھو جائے...... وہ تا دیر اس لمس کو محسوس کرتی رہی۔

مائی جنت اور زینب کی پہلی لڑائی تب ہوئی، جب مائی جنت نے محسوس کیا کہ زینب غیر محسوس طریقے سے گھر کے تمام انتظامات پر قابض ہوتی جا رہی ہے۔ تب اسے اس کا وجود انتہائی کراہت انگیز معلوم ہوا اور سینے میں ایک عجیب سی سوتیاڈاہ محسوس کی۔ اس روز جب مائی چودھریوں کے گھر کے کپڑے دھو کر لوٹی تو زینب چارپائی پر چڑھی پر چھتی کے برتنوں کی ترتیب بدل رہی تھی۔
مائی جنت کے تو ساتوں کپڑوں آگ لگ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چٹیا سے کھینچا اور

بالوں سے گھسیٹتی ہوئی کوٹھے سے باہر لا کر پھینک دیا۔

''بڈھی گھوڑی! جمعہ جمعہ آٹھ دن کے لئے کیا آئی ہے کہ مالکن بن بیٹھی میرے گھر کی......''

زینب اس بلائے ناگہانی سے سنبھلتے ہوئے اٹھی اور اپنے بال سمیٹتے ہوئے چیخی۔

''میں خودنہیں آئی......لائی ہو مجھے پچاس آدمیوں میں حق نکاح کر کے لائی ہو۔اب اس گھر سے مجھے کون مائی کا لال نکالے گا؟''

''میں نکالوں گی میں......''جنت نے سینے پر تڑاخ تڑاخ ہاتھ بجایا۔اس طرح باہر پھینکوں گی جیسے گھر کا گودڑ پھینکا جاتا ہے۔''

''میرا پھوا بھر بچہ اور تو اس کی ماں سے بھی بڑی......''

''بڑی ہوں یا چھوٹی ہوں، بیاہ کر لایا ہے مجھے......میں نے جس مرد کے لئے چھوٹے بچوں کو چھوڑا ہے وہ اتنا بے ایمان نہیں جو مجھے چھوڑ دے۔''زینب نے اپنے کپڑوں کو جھاڑا جو دھول میں لتھڑ گئے تھے۔

''اے ہے یہ ارادے ہیں تیرے......اری تجھے تو میں......''

مائی غضب ناک ہو کر آگے بڑھی اسے چٹیا سے کھینچ کر دھڑام سے نیچے گرایا اور تھاپے سے پیٹنے لگی۔یہاں سے وہاں تک عورتیں دیواروں سے سر نکالے اس تماشے سے محظوظ ہو رہی تھیں۔تبھی سانول گھر میں داخل ہوا تو جنت نے چیختے ہوئے کہا۔

''سانول! دیکھ رہے ہو اس کی زبان کیسے قینچی کی طرح چل رہی ہے۔دیکھ رہے ہو اسے، آگ لینے آئی اور گھر والی بن بیٹھی۔''

سانول نے کندھے سے کسی اٹھا کر پرے پھینکی۔زینب بھی اب تک کھڑی ہو چکی تھی۔چہرے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے اس ناروا سلوک پر لب وا ہی کرنا چاہتی تھی لیکن سانول نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔اسے بالوں سے گھسیٹا اور گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع کر دی۔وہ اسے یوں پیٹ رہا تھا جیسے فرش کے روڑوں کو دُرموٹ سے کوٹ رہا ہو۔وہ چیخ رہی تھی۔

''مارو......اور مارو......''آج میں تیرے ہاتھ سے مر کر چین لوں گی۔

آج اپنی ماں کی حسرت پوری کر دے۔اس کم ذات کے سینے میں ٹھنڈ ڈال دے۔''

عورتیں دیواروں سے لگی دبی دبی ہنسی ہنس رہی تھیں ۔زینب نے ان کی طرف نفرت سے تھوکا۔

''کم بختو!تم کیوں دانت نکالتی ہو،تمہیں نہیں پڑتیں کیا؟''

''عورتیں کھسیانی سی ہنسی ہنس دیں جیسے ان کی چوٹوں میں ٹیسیں اٹھ گئی ہوں''

''مرد ہے میرا،حق ہے اس کا...... چاہے میری ہڈیاں توڑ ڈالے۔''

اس نے ڈھیلا کھینچ کر عورتوں کی طرف اچھالا۔سانول مزید غضب ناک ہو گیا۔زینب کے دانتوں سے خون رسنے لگا تھا،ناک سے خون کی دھاری پھوٹ نکلی تھی۔جسم پر جابجا خون جم جانے سے نیل پڑ گئے تھے۔لیکن سانول کا غصہ تھا کہ کم ہونے میں نہ آتا تھا،اب اس کے ہاتھ میں شہتوت کی چھڑی آ گئی تھی،جو جہاں پڑتی ایک سرخ لاس چھوڑ جاتی۔زینب دھول میں گودڑ سا بنی چیخ رہی تھی۔''مارو اور مارو......آج میں تمہارے ہاتھوں مروں گی۔زمین پر گول مول ہو کر دیواروں سے جھانکتی عورتوں کی طرف ڈھیلے،چھڑیاں اور کنکر اچھالنے لگی تھی۔''تم کیا دیکھتی ہو۔''میرا سائیں ہے...... چاہے مجھے قتل کر ڈالے۔بوٹیاں نوچ ڈالے جاؤ اپنے خصموں کو دیکھو۔اس یار کو کیا دیکھتی ہو۔''

سانول اسے اور شدت سے پیٹنے لگا۔جب مائی کی کافی تسلی ہو گئی تو اس نے سانول کے ہاتھ سے چھڑی چھین لی۔

''دفع کر...... کیوں اپنی جان کو ہلکان کرتا ہے ہم نے کون سی رکھنی ہے۔تھوڑے دن رزق رہ گیا ہے اس کا دفع ہو جائے گی۔''

زینب بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پھر کھڑی ہو گئی۔

''کون ہے مجھے نکالنے والا؟ کون؟...... میں جانے کے لئے نہیں آئی۔''

''سن رہے ہو۔اس کی بکواس''

مائی نے بیٹے کو پھر اشتعال دلایا۔تو سانول پھر پل پڑا اور جب تھک گیا تو باہر نکل گیا۔اس کے پیچھے مائی بھی چلی گئی۔زینب دیوار سے لگی بین کرتی رہی۔اس کی ناک اور منہ سے خون کے قطرے ٹپک کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔اور قمیض کا گریباں لال ہو گیا تھا تبھی دیوار سے سر نکال کر رضیہ نے کہا۔

''زینب!زیادہ تکلیف ہے تو ہلدی تیل لگا دوں۔''

زینب نے ڈھیلا تاک کے مارا جو رضیہ کے سر پر بج کر پھوٹ گیا۔

''مت بک مجھے مردا کر تیرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑی ہے، میں جانتی ہوں میرے مرد پر تو بری نظر رکھتی ہے۔ جا کھسمہ کھالے کہیں اور۔ میرے مرد کا پیچھا چھوڑ دے۔ میں تو پہلے دن سے تیرے چونچلے دیکھ رہی ہوں پر تیرے ارمان پورے نہ ہونے دوں گی۔''

رضیہ نے لسی کا مٹکا دیوار سے کچھ یوں ٹپکایا کہ زینب ساری کی ساری سفید سفید لسی میں تربتر ہو گئی۔ وہ خوفناک عزائم لئے دیوار پر چڑھ گئی۔

''اری تجھے تو کوئی مارنے والا بھی نہ جڑا'' دوسروں کے مردوں پر جال پھینک رہی ہے۔''

اس نے رضیہ کے سب اگلوں پچھلوں کو تو م ڈالا، لیکن رضیہ یوں کام میں مصروف رہی جیسے کچھ سن نہ رہی ہو۔

مائی سیدھی چودھری کی حویلی گئی اور پورے قد سے چودھری کے قدموں میں گر گئی۔ ''چودھری جی! اب میں اس عورت کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی......''

چودھری ''جی! کچھ کریں۔''

''چودھری صاحب نے کہا، آیا تھا غلاما میرے پاس۔ میں نے اس سے دوٹوک بات کی کہ ہمارا بازو ہمارے حوالے کرو اور اپنا لے جاؤ۔''

''پھر جی......؟''

مائی کی سانس سینے کی دھونکنی میں اٹک گئی۔ چودھری صاحب نے چلم کے کوئلوں کا جائزہ لیا۔

''اوئے کرمو' یہ تو ٹھنڈی ہے۔''

چودھری جی نے چلم کی طرف اشارہ کیا: ''جی چودھری جی!......ابھی گرم کیے دیتا ہوں۔''

''پھر جی............ مائی کو خفقان ہونے لگا۔''

''تم دیکھو تو سہی رب کے رنگ......''

مائی دامن پھیلا پھیلا کر دعا دینے لگی۔ اور جب واپس آئی تو زینب سانول کے سامنے کھانے کی چنگیر رکھ چکی تھی۔ وہ آٹے کے حلوے کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور زینب اپنے پلو سے کھیاں جھل رہی تھی۔ جنت کا کلیجہ ہی جل گیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر مسکرا دی کہ چند دن ہی کی تو مہمان ہے۔ لیکن مہمان تو

جی کا جنجال ہو گیا، اور مہمان اور میزبان کے درمیان زوروں پر ٹھن گئی۔ یہ معمول کی جھڑپوں کا آغاز و انجام ہمیشہ یکساں ہوتا۔ پہلے سرحدی گولہ باری شروع ہوتی پھر سانول کی مداخلت سے گھمسان کا رن پڑتا، زینب اپنے ایک ایک زخم اور سوجن کو یوں دیکھتی جیسے بدن پر امتیازی تمغے سجے ہوں۔

''آئے گا تو دکھاؤں گی نا سارے زخم...... اسی سے ہلدی تیل بھی لگواؤں گی...... ہاں تو اور کیا......''

اس تصور سے ہی اس کی ضربوں کو آسودگی ملنے لگتی اور شاید وہ ہلدی تیل لگوانے سے ملنے والی راحت کے احساس سے ہی چپ چپتے یہ وحشیانہ مار سہہ لیتی تھی۔

ایک روز اس کی بڑی بیٹی اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آئی اور ماں سے لپٹ کر بہت روئی، کہنے لگی ''اماں گھر چلو۔ سارے چھوٹے بہن بھائی رل گئے ہیں۔ سب ہمیں مارتے ہیں۔ شریک طعنے دیتے ہیں'' زینب نے انہیں بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور رقت آمیز آواز میں بولی۔

''تم تو سمجھ دار ہو عورت کا ایک بار جہاں نکاح ہو جاتا ہے وہی اس کا گھر ہوتا ہے۔ وہی مرد اس کا سائیں ہوتا ہے۔'' ''اب میں وہاں کیونکر آسکتی ہوں اپنے گھر اور اپنے سائیں کو چھوڑ کر......؟''

لڑکی کی ہچکیاں رک گئیں اور اس نے ہیجانی انداز میں ماں کا منہ نوچ ڈالا اور غم و غصے سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

''تو اب کاہے کو آئے گی ہمارے باپ کی ٹھنڈی مٹی کی ڈھیری پر بیٹھنے...... اب تجھے گھبرو جو مل گیا ہے۔''

''زینب نے اسے سینے سے بھینچ لیا نہیں میری بیٹی نہیں، مجھے غلط نہ سمجھ''...... میں خود تھوڑی آئی ہوں۔ بزرگوں نے حق نکاح کیا ہے۔ اب......''

لڑکی نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور نفرت سے زمین پر تھوکا۔ ''رہ تو اپنے خصم کے پاس...... ہم بھی جی لیں گے۔''

یہ کہہ کر بچے کو اس کی گود سے چھین کر چل پڑی۔ زینب آہستہ آہستہ قدموں سے کچھ دور تک ان کے پیچھے گئی۔

''میرے بچو! میں کیسے آسکتی ہوں؟'' ''میں اپنے باپ کا قول کیسے ہار سکتی ہوں۔''

وہ سسک رہی تھی۔ تبھی مائی جنت کیکروں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی سامنے آ گئی۔

''اے ہے...... تو کیسے نہ جائے گی تیرا تو باپ بھی جائے گا تجھے اپنے بچے کے گلے کی رسولی نہیں بننے دوں گی نکال باہر پھینکوں گی۔''

''کون نکالے گا مجھے ذرا نکال کے تو دیکھ؟''

زینب خم ٹھونک کر میدان میں آ گئی اور معمول کا تماشہ بیچ چوراہے شروع ہو گیا۔

ایک روز چودھری صاحب نے مائی جنت کو اپنے ڈیرے پر بلا بھیجا اور کہا۔''مائی تیرے لئے خوشخبری ہے۔''

مائی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے غلاما آیا تھا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر منتیں کر رہا تھا کہ میری بہو واپس کر دیں میرے بیٹے کی اولاد رل گئی ہے۔ اور میں اپنی بیٹی...... کیا بھلا سا نام ہے اس کا......؟''

''کوثر پروین''...... مائی دل اور روح کی گہرائیوں اور سرشاریوں سے بولی......''ہاں ہاں...... وہی جس سے اپنے سانول کا نکاح ہو چکا ہے، کہہ رہا تھا۔ اسے لے جاؤ......''

''پھر جناب!......؟ مائی کی دھڑکن رکنے کے قریب تھی۔''

''پھر میں نے سوچا کہ انہیں کافی سزا مل چکی ہے، اب انہیں معاف کر دینے میں کیا ہرج ہے، میں نے کہا کہ اچھا ٹھیک ہے۔''

''اب وہ صبح...... کیا نام ہے تمہاری بہو کا''

''جی کوثر پروین''

''ہاں ہاں اسی کو چھوڑ جائے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ اب ہم میں برات لانے اور دوسرا خرچہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''مان گیا جناب پھر......'' مائی نے رکتی ہوئی سانسوں میں پوچھا۔

''ہاں ہاں...... مانتا کیسے نا! ۔صبح لڑکی کو چھوڑ جائیں گے میرے ڈیرے پر اور اپنا بازو لے جائیں گے۔'' کاغذ ہم کل ہی دے دیں گے۔

اوئے کرمو! اوئے کدھر سو رہا ہے؟۔

چودھری صاحب نے تمباکو کی کھانسی کی، اور مائی پورے قد سے چودھری کے قدموں میں گر گئی!
اتنی دعائیں دیں کہ اتنی تو شاید چودھری صاحب نے عمر بھر میں نہ لی ہوں گی۔

گھر پہنچتے پہنچتے مائی یہ خوشخبری گاؤں کے ہر بچے، عورت، مرد ڈھور ڈنگر کو سنا چکی تھی کہ کل اس کی بہو کوثر پروین آرہی ہے اور یہ بڈھی ڈائن واپس جارہی ہے۔

مائی جب گھر پہنچی تو دیکھا کہ وہ سانول کی پائنتی بیٹھی کھانا کھا رہی ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا چلو کھانے دو آج کے ٹکڑوں پر اس کی مہر لگی ہے، پھر کہاں کھائے گی اس گھر کا او کھر۔

یہ سوچتے ہوئے مائی کے اندر عجیب تسکین سی بھر گئی۔ لیکن پھر اسے پچھلے چار مہینوں کے فسادات اور جلی کٹی یاد آ گئیں۔ اس نے بڑھ کر چنگیر اس کے ہاتھ سے چھینی۔

''چل اٹھ! اپنی گٹھڑی باندھ لے صبح دفع ہو رہی ہے تو...... بس اب تیرا دانہ پانی اٹھ چکا کھالیا جو اس گھر کا او کھر کھانا تھا۔''

''میں کیوں جاؤں نکاح ہے میرا اس سے...... مر کر بھی نہ نکلوں اس گھر سے۔'' اس کے حلق میں کیکر کی سولیں سی پروئی گئیں۔

''اری کیسا نکاح......؟ مائی نے ہوا میں بازو لہرائے۔ دو انگل کاغذ کا محتاج ہے نا یہ نکاح۔ مل جائے گا تجھے وہ کاغذ۔ کل ہی مل جائے گا۔''

''نہیں نہیں میں نے طلاق نہیں لینی'' ۔زینب چیخ پڑی۔ میرا مرد مجھے طلاق نہیں دے سکتا۔''

اے ہے...... آئی تھی نا تو کنج کنواری جو طلاق کا ڈر ہے۔ ایسی بے شرم عورت میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی۔ جو بیٹوں سے بھی چھوٹے لڑکے پر قابض ہو رہی ہے۔

''جا کوئی اور ڈھونڈ لے۔ کوئی بڈھا۔ کوئی رنڈوا۔ کوئی گدھا اپنے جوڑ کا......''

زینب تیورا کر اٹھی۔'' اری تو رانڈ ڈھونڈ اپنے لئے...... میں کیوں ڈھونڈوں؟ میں سہاگن ہوں سہاگن رہوں گی۔ یہی تو بھانبھڑ بل رہا ہے تیرے سینے میں، یہی تو ساڑا ہے تجھے۔''

''ہے کم بخت'' وہ دونوں گتھ گئیں۔

سانول تمام صورت حال سے لاتعلق کبوتروں کو دانہ کھلانے لگا۔ ان حالات میں تو سانول اس کی چمڑی ادھیڑ دیا کرتا تھا۔ روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ لیکن آج غیروں کی طرح الگ تھلگ

کھڑا ہے، اسے مارتا کیوں نہیں۔ وہ اس کی عورت ہے اور مار کھانا حق ہے اس کا اور فرض بھی......اس کا پورا وجود سانول کے گھونسے اور لاتیں کھانے کے لئے ترس رہا تھا، زینب کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔
وہ تڑپ کر اس کے قدموں میں گر گئی۔

''مجھے مارو سانول ماہی! مجھے مارو......میں تمہاری ماں سے زبان درازی کر رہی ہوں۔ مجھے مارو۔''

وہ تڑپ تڑپ کر زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ لیکن سانول ٹس سے مس نہ ہوا۔ البتہ مائی جنت نے اسے گھسیٹ لیا۔ ''خبردار! جو میرے پھوا بھر بچے کو کوئی پٹی پڑھائی۔ آج سے یہ تیرے لئے نامحرم ہے۔''

''کیوں نامحرم ہے......؟ نکاح ہے میرا اس سے داعیہ ہے میرا اس پر'' وہ تنتنا کر کھڑی ہوئی۔
''یہ تیرا مان بھی ابھی ٹوٹ جاتا ہے۔ دے دے بیٹے اسے طلاق مار دے تین حرف اس کے کالے منہ پر......''

سانول کے لب پھڑ پھڑائے اور زینب چیختے ہوئے اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔
''نہیں نہیں...... مجھے طلاق نہ دینا، سانول ماہی مجھے اپنے قدموں میں رہنے دو۔''
وہ اپنے پاؤں اس کی گرفت سے چھڑا کر باہر نکل گیا۔

رات مائی نے اپنی چارپائی سانول کے پاس بچھائی۔ اور رات گئے تک آنے والے خوش کن لمحات کے متعلق باتیں کرتی رہی، سانول نیند سے بوجھل آواز میں جواب دیتا رہا۔
''سانول! کوثر پروین بڑی خوبصورت ہے۔''
''اچھا ماں......!''
''ارے ہاں گوری چٹی، بڑی بڑی آنکھیں، کمان سی کھینچی کمر کو چاہے بل دے کر گرہ ڈال دو۔ جنگلی کیکر سا نکلتا قد، ہونٹ لیموں کی ڈلیاں انگلیاں لس لس کرتی کچی مولیاں،......ایمان سے تو دیکھے تو غش کھا جائے۔''
لیکن سانول نیند کے خمار میں ابھی سے غش کھا رہا تھا۔
سانول! تو سو گیا ہے......ہاں، سو ہی گیا ہے، لیکن سانول! کوثر پروین کے بال ریشم کے

لچھے......سور ہے ہو سانول!......اور ناک......اور ہاں ناک......ناک"

ناک کے لئے شاید اسے کچھ زیادہ موزوں تشبیہ نہ سوجھی۔اور وہ دل ہی دل میں ناک کی خوبصورتی کے قصیدے پڑھتی رہی۔خوشی کے مارے اسے نیند ہی نہ آ رہی تھی نہ جانے کب آنکھ لگی اور مؤذن نے ابھی اذان نہ دی تھی کہ آنکھ کھل بھی گئی۔اس نے سانول کی چار پائی کی طرف دیکھا وہ موجود نہ تھا،شاید باہر کسی ضرورت سے گیا ہو۔

وہ تصور میں کھو گئی۔اس کی برسوں کی مراد آج پوری ہو رہی تھی اس کی بہو آج آ رہی تھی......نوعمر اور خوبصورت،اور یہ باسی کڑھی،خمیری روٹی،بڈھی بھیڑ کا دانہ پانی یہاں سے اٹھ رہا تھا۔

"آئی تھی بڑی میری بہو بننے،میرے بیٹے پر قبضہ جمانے......گھر ہے میرا،سائیں ہے میرا......آئی گھر والی،سائیں والی......"

مائی نے نفرت سے تھوکا۔اور گردن گھما کر شعلہ بار آنکھوں سے زینب کی طرف دیکھا لیکن......اس کی چار پائی خالی تھی......مائی کو بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔وہ سرعت سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اندر کوٹھے میں گئی......زینب اور سانول دونوں کے کپڑے غائب تھے اور وہ دو سو روپیہ بھی پرچھتی پہ دھری چینک میں موجود نہ تھا،جو وہ رات ہی بڑے چودھری سے کوثر پروین کی آؤ بھگت کے لئے مانگ کر لائی تھی۔

مائی جنت نے زور سے سینے پر گھونسہ مارا اور کچے فرش پر یوں بیٹھ گئی جیسے دن دیہاڑے لٹ گئی ہو۔

آپے رانجھا ہوئی

اکھاڑے کی بھربھری سُرمئی مٹی میں ابھی رات کی نمی کے آثار باقی تھے۔کسرت کرتے پہلوانوں کے منہ سے نکلتی ''ہوں اوہوں، ہوں'' کی لمبی اور پرمشقت آوازیں سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔اس کے بالمقابل ڈنڈ پیلتے ہوئے اسلم نے سانس توڑ کر رازدارانہ انداز میں ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ کہتی ہے، رحیمے کا غرور نہ توڑ دوں تو زہرہ نام نہیں......''

''ہوں''رحیم داد کے ہونٹوں سے ایک لمبی اور ترش ''ہوں'' کی آواز نکلی۔جس کا تلخ ذائقہ اس کے حلق میں گھل گیا۔جی تو چاہا،رک کر کہے کہ اس چھنال سے کہو،عورتوں سے منہ لگانا مردانگی نہیں...... یہ سامنے جوٹیٹری کی ٹانگوں والا تیرا بھائی ''ہوں، ہوں'' کی بے دم آوازیں نکال رہا ہے اسے کہو میرے مقابل آئے،ایک ہاتھ میں منکا نہ توڑ دوں تو......لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں بولا کیونکہ استاد کا حکم تھا کہ کسرت کرتے وقت سانس نہیں توڑنا۔اس کی ''ہوں اوہوں، ہوں'' کی آواز رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں پھیلتی رہی لیکن استاد جو اندھیرے میں دیکھنے کی بلی کی سی صلاحیت رکھتا تھا،سر پر پہنچ گیا اور اپنی باریک چھڑی اسلم کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے بولا۔

''اوئے بے غیرتا! میں تجھے پھر کہتا ہوں کہ یہ پہلوانی تیرے بس کا روگ نہیں...... چھوڑ دے اسے اور ہل پھال جوت کر زمین کھود، جو تیرا نصیب ہے۔خود تو تو کیا ہی معرکہ مارے گا اس پٹھے کو بھی

خراب کرے گا...... یہ میرا شیر جس نے دو مہینے بعد تحصیل کے سب سے بڑے پہلوان سے زور کرنا ہے اور اے۔سی صاحب سے کاغذ لینا ہے، جس کے جوڑ کا بیس گاؤں اِدھر اور بیس گاؤں اُدھر کوئی پہلوان نہیں، یہ میرا جوان جس کا جسم چیتے کا اور گرفت شیر کی سی ہے۔''

یہ جملے ادا کرتے وقت استاد کی گردن اکڑ گئی تھی، سینہ تن گیا تھا اور آواز میں تمکنت بھر آئی تھی۔

رحیم دادا نہماک سے ڈنڈ پیلتا رہا۔''ہوں اوہوں، ہوں'' کی جاندار آوازیں پوری فضا کا احاطہ کئے ہوئے تھیں...... کھیتوں میں فصل کٹ کر اناج گھروں میں آ چکا تھا۔ کھیتوں کو پانی دینے کے بعد کسانوں نے ہل چلا کر سہاگہ پھیر دیا تھا اور اب زمین خریف کی فصل بونے کے لئے تیار تھی۔ سرمئی مٹی کے ہموار کھیتوں کے تھال، درختوں کے گھنے جھنڈ اور چکنی مٹی سے لپے کچے کوٹھے سب تاریکی میں جذب تھے۔ گاؤں کے اس پار بڑی نہر کے کنارے پہلوانوں کے مضبوط نرخروں اور ناک کی ہڈی سے نکلتی ''ہوں، ہوں؟'' کی آوازیں، کبھی کبھی پرندوں کے پھڑ پھڑانے اور جنگلی جانوروں کے بولنے کی صدائیں سب اس گونگے سکوت کا حصہ بن گئی تھیں، تبھی گاؤں کے آخری سرے پر کسی مرغ نے پر پھڑ پھڑا کر اور گردن اکڑا کر بانگ دی اور پھر اس کے جواب میں ہر کونے سے، ہر گھر سے، ہر چھت سے چھوٹے بڑے ہر قسم کے مرغوں کی بانگوں کا لامتناہی مقابلہ شروع ہو گیا اور تبھی استاد کی صدا گونجی۔

''چلو پٹھو! نہر کے آخری پل کے کیکروں کو ہاتھ لگا کر آؤ۔''

سارے پہلوان شمال کی سمت بھاگنے لگے۔ وہ نہر کے کنارے کنارے دوڑ رہے تھے۔ نہر کے گیلے کنارے اور درختوں کی گھنی قطاروں کے بیچوں بیچ جاتے راستے پر جوانوں کے مضبوط قدم گھوڑے کی ٹاپوں کی مانند پڑ رہے تھے۔ رحیم دادان سب سے آگے تھا۔ اس کے پاؤں کچھ یوں زمین کو چوم کر اٹھ رہے تھے جیسے عربی النسل گھوڑے کے سموں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں۔ باقی پہلوان آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے۔ اسلم نے اسے پیچھے سے کئی آوازیں دیں۔

''رحیمے......رحیم داد......''

رات کی گنگ تاریکی میں اس کی آواز کی گونج دور تک گئی۔ شاید کوئی سانپ مارا تھا انہوں نے، لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آخری پل کے کیکروں کو چھو کر جب وہ دوڑتا ہوا واپس آ رہا تھا تو باقی پہلوان اسے راہ میں ملے۔ اسلم نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کترا کر گزر گیا۔ نہر کے

بہاؤ کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا جب وہ اکھاڑے میں داخل ہوا تو مؤذن کی پاکیزہ آواز فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے ساکت و جامد کھڑا ہو گیا۔ جب اذان ختم ہوئی تو اس نے پوروں کو جوڑ کر آنکھوں اور ہونٹوں کو چھوا اور ایک بوسے کی آواز پیدا ہوئی۔

''کئی لگا پیچھے...... کئی لگا'' استاد نے حکم دیا۔

وہ کدال پکڑ کر اکھاڑے کی بھربھری زمین کھودنے لگا۔ تب کسان بیلوں کو ہانکتے اور انہیں دن بھر کی مشقت کے لئے تیار کرتے کھیتوں کو جا رہے تھے۔ سب نے رحیم داد کو کدال لگاتے دیکھا اور ایک عجیب سی سرشاری کے عالم میں ''شاباش اوئے شیرا!'' کے لفظ بولتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جہاں تک ممکن تھا مڑ مڑ کر دیکھتے رہے اور ستائشی کلمات ادا کرتے رہے اس سنسنی کے تصور سے ان کے اندر بجلی کوند جاتی تھی رحیم داد جو کہ ان کے گاؤں کا سپوت تھا، بڑے بڑے پہلوانوں کو لحہ بھر میں چت کر ڈالتا تھا اور وہ ڈھول بجاتے، ناچتے گاتے بجی سجائی بیل گاڑیوں پر سوار نعرے لگاتے، رحیم داد کو ہاروں اور پھولوں سے لاد کر واپس اپنے گاؤں لاتے تھے۔ جب باقی لڑکے دوڑ مکمل کر کے اکھاڑے میں داخل ہوئے تب استاد نے زور کا حکم دیا۔ رحیم داد تن کر اکھاڑے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بازوؤں اور سینے کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں، گردن کے نیچے کندھوں کے اردگرد ہموار پتھر بھرے تھے جو ایک اعصابی تناؤ میں حرکت کر رہے تھے۔ پتلی کمر، اندر دھنسا ہوا گول پیٹ، رانیں اور پنڈلیاں، جیسے لوہے کی سلاخیں ترتیب وار پرودی گئی ہوں اور اوپر تانبے کی رنگت کی سی کسی ہوئی جلد منڈھ دی گئی ہو...... جیسے وہ سنگلاخ پتھروں اور خوفناک چٹانوں کو آہنی قدموں تلے روندتا چلا آ رہا ہو۔ قوت، مہارت اور مردانہ وجاہت کا بے مثل، شہکار...... وہ زہرہ کے بھائی نذیرے کے بالمقابل آ گیا اور بے باک انداز میں آہنی پنجے میں اس کی گردن دبوچ لی۔ کئی گھمیریاں دینے کے بعد ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ تڑاخ سے بھربھری زمین پر ہموار تھا۔ عام حالات میں وہ ایسے معمولی درجے کے پہلوانوں کو گرا کر کوئی خوشی محسوس نہ کرتا تھا اور انہیں لڑکھڑاتے دیکھ کر چھوڑ دیا کرتا تھا لیکن آج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔

''اپنی بہن......''

''اوئے، بس اوئے جوان!'' استاد نے سمجھا کہ شاید وہ کوئی گالی دینے والا ہے، اسے بازو سے پکڑ کر اکھاڑے کے دوسری طرف لے جاتے ہوئے نرمی سے بولا ''غصہ پہلوان کے لئے خطرناک

ہے...... حوصلے سے جوان! حوصلے سے......"

باقی ماندہ پہلوان باری باری اس سے بھڑے اور دو تین حملوں میں زیر ہو گئے تب استاد کے حکم کے مطابق سارے بیک وقت اس پر پل پڑے، رحیم داد ایک پھرتیلے چیتے کی طرح ان کی گرفت سے نکلا، اپنی ٹانگوں کو زور سے جھنجھوڑا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹے چڑیوں کی مانند وہ سارے دور دور بکھر گئے۔ وہ جا کر استاد کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"شاباش، اوئے جوان!"

استاد نے اس کے مضبوط کندھے پر تھپکی دی۔ لڑکے نیم گرم سرسوں کا تیل لے کر اس کے جسم کی مالش کرنے لگے۔ مالش کرنے والے لڑکوں کے ہاتھ اس کے جسم کو چھوتے ہوئے کچھ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے فولاد کا بنا کوئی آہنی ماڈل ہو، جس کا ہر پٹھا، ہر مسل، ہر ابھار بالکل صحیح جگہ پر درست انداز میں ابھرا ہو۔ باقی لڑکے مالش کے دوران آئندہ آنے والے دنگل کے متعلق باتیں کرنے لگے رحیم داد تمام گفتگو سے بے نیاز خاموش بیٹھا رہا۔

رحیم داد عام دیہاتی نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ اسے محض فن سے محبت تھی۔ وہ گاؤں کے کسی لڑائی جھگڑے، تماشے یا قصے کہانیوں میں ہرگز شریک نہ ہوتا تھا۔ ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ، انیس برس تھی۔ اس کا چہرہ معصوم تھا جس پر بھولپن برستا تھا۔ نیا نیا اُگا سبزہ خط بڑی بڑی آنکھوں اور اونچی ناک والے پرکشش چہرے پر وہ بانک پن تھا جو اس کی عمر کے معصوم لڑکوں کے چہرے پر اکثر ہوتا ہے لیکن وہ علاقے کے نامی گرامی پہلوانوں کو چت کر چکا تھا۔ اب اس کا مقابلہ تحصیل کے بڑے پہلوان سے طے تھا جو عمر میں اس سے دوگنا اور تجربے میں لاثانی تھا لیکن اس کے استاد کو اس کی فرمانبرداری، شرافت، قوت و دسترس اور چستی سے یقین کامل تھا کہ وہ اس تجربہ کار پہلوان کو مارے گا اور اے۔ سی صاحب سے کاغذ اور پانچ ہزار روپیہ کا انعام حاصل کرے گا۔ اس کے بعد وہ ضلع کی سطح پر رستم ضلع سے مقابلہ جیت کر ڈپٹی کمشنر سے انعام وصول کرے گا اور رستم ضلع کہلائے گا...... یہ سب کچھ سوچتے ہوئے استاد کے منہ سے اضطراری اور اعصابی سی بے معنی آوازیں نکلنے لگتیں۔

گندم کی خشک پکی بالیوں کی سی رنگت والا اس کا گٹھا ہوا جسم تیل مل جانے کے بعد دوپہر کے سورج کی مانند چمکنے لگا تھا اور تمام مسل مزید نمایاں ہو گئے تھے جیسے انہیں خط کشیدہ کر دیا گیا ہو۔ سورج

جب درختوں کی بلند شاخوں سے نبرد آزمائی کرنے کے بعد کھیتوں پر پھیل گیا اور کبوتروں، چڑیوں، لالیوں اور فاختاؤں کے پرے کے پرے کھیتوں میں نئے نئے بوئے بیجوں کو کریدنے لگے اور جو کھیت ہل چلانے سے رہ گئے تھے ان میں بکھرے ناڑ سٹے اور دانے چننے کے لئے زمین پر بچھ گئے اور گاؤں کے تنوروں سے دھواں اٹھ کر فضا میں بگولے بنانے لگا تو وہ نہر کے پل سے چھلانگ لگا کر مٹیالے پانی میں نہانے لگا۔ نہر کے خطرناک پل کے نیچے سے تیرتے ہوئے وہ کئی بار گزرا اور تادیر تیرنے اور نہانے کے بعد اس نے سرخ کناری والی لنگی باندھی، سفید براق کرتا پہنا جس کے ساتھ سونے کے بٹن جلترنگ بجا رہے تھے اور اک پہر دن چڑھے وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کی ماں سامنے چھپری میں چولھے کے سامنے بیٹھی تھی جس کی چھت سے راکھ کے سیاہ لمبے لمبے جالے لٹک رہے تھے اور اپلوں کا دھواں بھرا تھا۔ دیسی گھی کے پراٹھوں کی خوشبو سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چوکی گھسیٹ کر ماں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اماں نے بادام کوٹ کر گڑ اور گرم گرم گھی میں ملا رکھے تھے۔ اس کے سامنے بڑی سی تام چینی کی بھری ہوئی رکابی رکھی اور چنگیر میں تر بتر گرم گرم پراٹھے ڈالتی گئی۔ وہ بے گنتی کے کھا گیا پھر اپلوں کی آگ پر گرم ہوتے دودھ سے بھرے مٹی کے بڑے سے مٹکے کو اپنے دوپٹے سے پکڑ کر اٹھایا، جس کی بیرونی اور اندرونی سطح دھویں سے سیاہ پڑ چکی تھی اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ دودھ کی سطح حیرت انگیز حد تک نیچے ہوتی چلی گئی۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ اپنے کھیت کی جانب چل پڑا۔ راستے میں لڑکیوں اور عورتوں کے قافلے سروں پر چنگیریں اور لسی کے مٹکے رکھے باہم چھیڑ چھاڑ کرتے منڈیروں پر چل رہے تھے، وہ رحیم داد کو دیکھ کر راستہ چھوڑنے اور سر جوڑ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ کبھی کبھی کسی ٹولی سے دبی دبی ہنسی کی آواز ابھرتی اور کوئی لڑکی بھاگتی ہوئی رحیم داد کے آگے آگے کولہے مٹکاتی ہوئی چلنے لگتی۔ پیچھے سے کوئی ہاتھ بڑھتا اور آگے چلنے والی لڑکی کی چٹیا کھینچ لیتا، لڑکی کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ منڈیر پر رحیم داد کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی، رحیم داد دوسری طرف چھلانگ لگا کر راستہ بدل لیتا اور اس پر ایک بھرپور قہقہہ گونجتا لیکن وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے قطعاً بے نیاز اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔

استاد نے گُر کی بات بتائی تھی کہ عورت ذات کی طرف دیکھنا، اس کا خیال دل میں لانا پہلوان کی موت ہے اور یہ گُر رحیم داد کے ذہن میں نقش تھا۔ ایسے مناظر تو وہ روز ہی دیکھتا تھا، علاقے کے ہر

گاؤں میں جہاں جہاں وہ کشتی لڑنے گیا تھا، نہ جانے کتنے معصوم دلوں کو آہیں بخش آیا تھا۔ علاقے کی ہر لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ رحیم داد تھا...... ظالم، مغرور، احمق سا...... لڑکیوں کو یوں چونچلے کرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب بیزاری برسنے لگتی۔ اس کا جی چاہتا کہ ایک ایک چپت سب کے لگائے اور ڈھیر کر دے لیکن عورت پر ہاتھ اٹھانا تو مرد کی توہین ہے نا...... چلتے چلتے اس کی نظر زمین سے چپکے ایک چتکبرے مٹیالے سانپ پر پڑی، وہ گھوم کر ہوا میں اچھلا اور پاؤں سانپ کے سر پر جما دیا اور اس وقت اٹھایا جب وہ بے دم ہو گیا۔ اس نے اپنی چھڑی سے جس کے دونوں سروں پر تانبے کا خول چڑھا تھا، اسے اٹھایا اور درخت کی شاخ پر لٹکا دیا۔ تھوڑی دیر میں چیونٹیوں کی قطاریں درخت کے تنے اور سانپ کے جسم پر رینگنے لگیں۔ یہ الگ بات کہ دنوں بعد تک گاؤں بھر کی لڑکیاں اس مردہ سانپ کو دیکھنے کے لئے آتی رہیں اور اس کی ڈب کھڑبی جلد پر ہاتھ پھیرتی اور آہیں بھرتی رہیں جس کو رحیم داد کے پاؤں نے چھوا تھا۔

رحیم داد اپنے کھیت میں پہنچا تو دھوپ کافی چڑھ آئی تھی۔ اس کا باپ بیلوں کو ڈانٹتے ہوئے بیائی کر رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر بندھی بیج کی جھولی تقریباً ختم ہونے والی تھی "ہلا ہل، الا الا ہلا" کی پرجوش آواز پر کسان اور بیل دونوں مٹی میں پسینہ گرا رہے تھے۔ جہاں جہاں بیج گرتا تھا پرندوں کے غول وہاں اتر رہے تھے اور نئی بوئی ہوئی زمین کو کریدنے لگتے تھے۔ ساتھ والے کھیت میں اللہ بخش لنگوٹ کسے ہاتھ میں کسّی پکڑے کھیت کو پانی لگا رہا تھا۔ وہ کھیت کی منڈیر پر کھڑا ہو کر باپ کی جھولی کے خاتمے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے پشت والے کھیت میں زہرہ ایک غصیلے بیل کی نکیل پکڑے اسے پانی کے کھال کی طرف لے جانے کی تگ و دو میں مصروف تھی اور قوی الجثہ جانور گھوم گھوم کر اور کھر اٹھا اٹھا کر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے کے لئے کوشاں تھا اور وہ اس کی نکیل کو بل دیتے ہوئے دھول کے غبار میں چھپی ہانپ رہی تھی۔

"تو خود کو سمجھتا کیا ہے...... میں بھی راجپوت کی بیٹی ہوں، تجھے زیر کر کے چھوڑوں گی۔"

وہ جانتا تھا کہ وہ مخاطب تو بیل سے ہے لیکن سنا اسے رہی ہے، اس کا جی تو چاہا کہ گھوم کر کہے۔

"میں عورتوں سے منہ نہیں لگاتا...... لے آ اپنے اُن آٹھ کڑ چھے بھائیوں کو، ایک لمحے میں ٹینٹوا نہ دبا دوں تو......" لیکن اس نے خود پر قابو پایا اور قریب ہی بیٹھی مسلسل بھونکتی کتیا کو ایک ہاتھ سے گردن کے بالوں

سے پکڑا اور اوپر اچھال کر زور سے پانی میں پھینک دیا۔ کتیا چاں چاں کرتی پانی میں تیرتی ہوئی ایک بھینس کی کمر پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور کناروں پر ٹرٹراتے بہت سے مینڈک شڑاپ سے پانی میں غوطہ لگا گئے۔

اس طرح کے جملے تو ہر روز ہر گاؤں میں ہر لڑکی اس پر اچھالتی ہی تھی لیکن زہرہ جو بات بھی کرتی وہ رحیم داد تک ضرور پہنچتی۔

آج زہرہ نے تنور پر بیٹھ کر عورتوں سے کہا

''کسی سے ڈرتی نہیں ہوں......وچ پنچایت کہتی ہوں کہ رحیمے کی دیوانی ہوں، مغرور ہے تو کیا اس کا یہی غرور تو مجھے لے ڈوبا ہے۔''

کوئی لڑکی جل کر کہتی ''اس کی دیوانی تو ہر لڑکی ہے......مزا تو جب ہے کہ وہ خود کسی کا دیوانہ ہو۔''

اس پر زہرہ چیخ کر کہتی ''خبردار، جو اس کا نام زبان پر لائی......گدی سے کھینچ لوں گی گندی زبان۔''

تب کافی خطرناک صورتحال پیدا ہو جاتی لیکن دوسری عورتیں بیچ بچاؤ کروا دیتیں۔

آج زہرہ نے کنویں پر سہیلیوں سے کہا ''دیکھنا سکھیو! ایک دن رحیما میرا ہوگا، صرف میرا...... ایک نہ ایک دن وہ میری طرف ضرور دیکھے گا اور مسکرائے گا بھی اور اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر لے جائے گا......میں اس وقت کے انتظار میں ساری عمر گزار سکتی ہوں۔''

دراصل اس پورے علاقے میں زہرہ جیسی غیر معمولی طور پر حسین اور بے باک لڑکی کوئی دوسری نہ تھی۔ علاقے کے تمام بڑے بڑے دبنگ قسم کے جوانوں نے قسمت آزمائی کی لیکن اس پتھر کو جونک نہ لگی تھی۔ کئی کئی قتلوں کا دعویٰ کرنے والے نوجوانوں کو وہ بارہا بے عزت کر چکی تھی اور پھر تن کر کہتی۔

''کون ہے مائی کا لال جو زہرہ کو سر کر سکے؟......اس کے جوڑ کا تو دنیا میں بس ایک ہی جوان ہے اور وہ بڑا سنگدل ہے۔'' تب اس کے نرگسی پیالوں کی سی آنکھوں میں دیپ جل اٹھتے اور گہرے گلابی گلاب کی سی رنگت میں سرخی دوڑ جاتی۔

اب وہی زہرہ پشت والے پانی کے کھال میں سے نئے نئے ہل میں جتے چترے بیل کو پانی پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ طاقتور جانور نتھنے پھیلا کر اور جسم کے تمام پٹھے اکڑا کر اس کے ہاتھ

سے رسہ چھڑوانے کی کوشش کر رہا تھا، کئی بار توی ہیکل بیل سر جھکا کر اور مونچھیں اکڑا کر یوں گھومتا کہ اسے سینگوں پر اٹھا کر کھال میں پٹخ دینا چاہتا ہو مگر وہ نکیل کو بل دے کر گھوم جاتی اور گرجتے ہوئے کہتی۔

''تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تیرے سامنے ہار مان جاؤں گی؟...... میں تو نکیل ڈال کر کھونٹے سے باندھ رکھوں گی۔ تجھے''

رحیم داد نے سوچا، وہ اس سے پوچھے تو سہی کہ وہ اس سے چاہتی کیا ہے؟ لیکن پھر اسے استاد کا قول یاد آ گیا۔ ''غیر عورت سے بات کرنا بھی اس کے لئے گناہ ہے۔'' وہ بیج کی جھولی اپنی کمر سے باندھنے لگا اور جب اس کا باپ اپنی جھولی کھول کر درخت کے سائے کی طرف آ رہا تھا، اس نے جا کر ہل سنبھال لیا۔ وہ ہل کے پھال پر زور دیتا ہوا بیج کی مٹھیاں بھر بھر کر سیدھی سیدھی نالیوں میں بکھیرنے لگا۔ اس کا باپ اس عرصے میں کھانا کھانے لگا تھا جو اس کی ماں گھر سے لے آئی تھی۔ ارد گرد کھیتوں میں کام کرتے کسان بار بار اس کی طرف ستائشی نگاہوں سے دیکھ لیتے اور درختوں کے مختلف جھنڈوں میں چھپی لڑکیاں جو ٹولیوں کی شکل میں بیٹھی اپنے جہیز کے لئے دوسوتی کی چادروں میں رنگ برنگے دھاگوں سے پھول کاڑھ رہی تھیں اور کروشیے سے جھالروں والے رومال بن رہی تھیں اور گندم کے ناڑ کو شوخ رنگوں میں رنگ کر چنگیریں بنا رہی تھیں، اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے اور جملے اچھالنے لگیں۔ ان کے قہقہے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سارے ماحول میں پھیل رہے تھے اور شاخوں سے لٹکتے بیا کے گھونسلے جھولنے لگے تھے۔ کوئی لڑکی دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

''ہائے نی! اسے کہو، میری طرف ایک بار دیکھ لے۔ پھر اس کے دیکھنے کے بعد تو میں مر ہی جاؤں گی۔''

کسی اور لڑکی نے چڑ کر جواب دیا۔ ''وہ تجھ کالی کلوٹی کی طرف کیوں دیکھے؟...... وہ تو آنکھ اٹھا کر زہرہ کی طرف نہیں دیکھتا جس کے حسن کا کوئی جوڑ نہیں، بے چاری ٹیٹری کی مانند اس کے گرد کرلاتی پھرتی ہے۔''

دوسری نے دانت سے رنگین دھاگے توڑتے ہوئے کہا ''اب بھی دیکھو، بیل سے کشتی لڑتے ہوئے کیسے ہانپ رہی ہے...... جیسے اسی سے لڑ رہی ہو۔''

ایسے میں کوئی ادھیڑ عمر عورت ان کی گفتگو سن لیتی تو دو ہتھڑ مار کر کہتی۔

''چپ کرونی کھچر یو! وہ تمہارے کچھ لگتے جن کے سنگ منگی ہو، سن لیں گے اور مفت میں خون خرابہ ہو جائے گا۔''

تب لڑکیوں کے قہقہے شاخوں سے لپٹے سسکیاں بھرتے رہتے۔

دوپہر چڑھے جب رحیم داد گھر واپس آیا تو اس کی ماں دودھ میں بادام پیس کر ملا چکی تھی اور دیگچہ سامنے رکھے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کے باپ نے چولھے میں دبے دہکتے ہوئے اپلے کو چلم میں بھرتے ہوئے کہا۔

''رحیم داد! تو کھیت میں کام کے لئے نہ آیا کر...... بس تو کھایا پیا کر اور پہلوانی کے گر سیکھ میرے بچے! میں بادام کی بوریاں اور دودھ دیتی بھینسوں کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔ ہم نے ضلع کا انعام جیتنا ہے اور ڈپٹی کمشنر سے کاغذ لینا ہے۔ پھر ہمارا نام پورے ضلع میں گونجے گا اور بڑے بڑے چودھری ہمیں عزت دینے پر مجبور ہوں گے۔''

تب اس کے باپ کی آنکھوں میں سرشاری اور امید کے دیپ جل اٹھے تھے اور اس کی گردن آپ ہی آپ اکڑ گئی تھی، ہاتھ پگڑی کے شملے کو درست کرنے لگے تھے اور اکڑی ہوئی مونچھوں کے نیچے وہ فخر بھری ہنسی ہنستا تھا...... اس کے باپ کرم داد کے چہرے پر پنجاب کے چند ایکڑ کے زمیندار کی مخصوص خود اعتمادی اور اکھڑ پن برستا تھا، اس کی ہتھیلیاں جانوروں کے کھروں کی مانند کھردری تھیں جن میں بیائیاں اور گرہیں پڑی تھیں۔ مضبوط اور کھلے ہاتھ پاؤں، اندر دھنسی آنکھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والا یہ چند ایکڑ کا زمیندار جسے اپنے قوت بازو پر بڑا بھروسہ اور ناز تھا۔

رحیم داد اپنی کم بولنے، کم ہنسنے اور کسی بھی معاملے میں بہت کم دلچسپی لینے والی طبیعت کے بموجب خاموش رہا اور چارپائی پر دراز ہو گیا جس پر چارخانہ والا کھیس بچھا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

عصر کی اذان سے پہلے اس نے بادام گھوٹ کر بنائی سردائی کے کئی گلاس چڑھائے اور اکھاڑے میں چلا آیا۔ اپنی روزمرہ کی ورزشوں اور کشتیوں میں مصروف رہنے کے بعد مغرب کے قریب وہ اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا کہ پیچھے سے اسلم نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یار! کبھی دنیا اور دنیا کے لوگوں کو بھی دیکھ لیا کر، مانا کہ تو رستم ضلع ہو جائے گا، لیکن......''

وہ اسے زہرہ کا آج کا دیا ہوا کوئی نیا چیلنج بتانا چاہتا تھا لیکن وہ سننے پر آمادہ نہ ہوا اور تیز تیز قدموں

سے چلتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا......استاد کا حکم تھا کہ اسے جلد سونا چاہیئے ۔دیر تک جاگنا پہلوان کے لئے نقصان دہ ہے۔اپنے صحن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جگالی کرتی بھوری بھینس کے سر پر ہاتھ پھیرا جو مانوس لمس محسوس کر کے اس کے بازو کو چاٹنے لگی۔بیلوں کی دونوں جوڑیاں ناند میں بھرے بھوسہ ملے سبز چارے کو منہ مار رہی تھیں۔اس نے ان کی پیٹھ تھپکی، پیار کے جوابی ردعمل کے طور پر ان کے جسموں میں جھرجھری پیدا ہوئی اور وہ اپنا سر اس کے ساتھ رگڑنے لگے جس سے ان کے گلے میں بندھے گھنگرو بج اٹھے۔ایک طرف جانوروں کے گوبر کا ڈھیر لگا تھا جس پر بیٹھا کنچوں کی سی آنکھوں والا بلا اسے گھور رہا تھا اور اونچی نیچی سطح پر جگہ جگہ جانوروں کا پیشاب تازہ گوبر بکھرا پڑا تھا۔جانوروں کے احاطے اور رہائشی علاقے کی حد بندی ایک چند انچ اونچا تھڑا بنا کر قائم کر دی گئی تھی جسے گوبر ملی سرخ مٹی سے لیپا گیا تھا اور دو کچے کوٹھے تھے جنہیں نیل ڈال کر چکنی مٹی سے پوچا دیا گیا تھا۔بڑے کوٹھے کے اندر انڈوں کے چھلکوں کو رنگ کر اور سگریٹوں کی پنی سے پھول بنا کر ہار سے لٹکائے گئے تھے۔خوبصورت نقش ونگار سے بجی پر چھتی پر کانسی، چینی اور کانچ کے برتن منزل در منزل جوڑ کر رکھے گئے تھے۔اندر بڑے بڑے پایوں والے رنگین پلنگ بچھے تھے جن پر سفید اور نیلے رنگ کے چار خانوں والے دوہرے کھیس بچھے تھے۔رنگین چوکیوں پر بستروں سے بھری دو پیٹیاں دھری تھیں۔دوسرے کوٹھے میں آدھے سے زیادہ حصے میں گندم، کھلی اور دوسرے اناج کی بوریاں رکھی تھیں اور آدھے حصے میں دوسرا گھریلو سامان پڑا تھا اور اس کی ماں چھپری میں اپلوں کے دھوئیں میں لپٹی رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔

ایک خنک صبح جب وہ کسرت ختم کر کے اسلم کے ساتھ گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اسلم سامنے سے آتی ایک لڑکی کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جا رہی ہے؟''

''ابے کو کھانا دینے......'' لڑکی نے ہونٹ سکیڑے۔

''مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

اسلم نے اس کی چنگیر سے روٹی اچکنے کی کوشش کی تو لڑکی نے کہنی اس کے سینے میں چبھوتے ہوئے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''خبردار...... جو چنگیر کو ہاتھ لگایا'' اور اسے دھکیلتے ہوئے دور لے گئی۔

''ہاتھ تو تیرے باپ کو بھی لگاؤں گا'' اسلم نے زور لگا کر لڑکی کو واپس دھکیلا۔لڑکی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ خشمگین نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو نے میرے باپ کو گالی دی......؟''

''نہیں......میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تجھے مانگنے کے لئے مجھے اس کے پاؤں کو بھی ہاتھ لگانا پڑا تو لگاؤں گا۔''

لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور ایک دوہری کی ہوئی تنوری روٹی جس میں مکھن کا چھوٹا سا پیڑا دبا تھا اور روٹی کی حرارت سے پگھل رہا تھا، چنگیر سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی......رحیم داد کے چہرے پر بیزاری سی آ گئی اور وہ انہیں وہیں بکواس کرتا چھوڑ کر گھر آ گیا۔

اسی شام جب سرمئی اندھیرا درختوں کے جھنڈ میں سرسرا رہا تھا اور نہر کے پانی کو دھندلا رہا تھا اور گاؤں کے تنوروں سے دھواں اٹھ کر بگولے کی شکل میں ہر سو چھا گیا تھا، وہ کسرت ختم کر کے آئندہ دنگل کے متعلق سوچتا ہوا تیز تیز قدموں سے گھر کی سمت آ رہا تھا کہ درختوں کے ایک جھنڈ میں سامنے سے آتے ایک ہیولے سے بری طرح ٹکرا گیا اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی لڑکی تھی اور شاید اسے کافی چوٹ آئی تھی کیونکہ وہ کراہ رہی تھی۔

''خود کو دھرتی کا رب سمجھتے ہو......انسان تمہیں دکھائی نہیں دیتے؟''

یہ زہرہ تھی جو اپنی ناک کو پلو سے دبا رہی تھی اور شاید ناک سے خون بہنے لگا تھا۔رحیم نے چیتل چڑھی چھڑی کو انگلی پر گھماتے ہوئے کہا۔

''تو عورت ہوتے ہوئے مجھ سے ٹاکرا کیوں لگاتی ہے؟ ان آٹھ گیدڑوں کو باہر نکال، مسل کے نہ رکھ دوں چیونٹیوں کی طرح......'' اس نے نفرت سے زمین پر پاؤں پٹخا۔

زہرہ نے فضا میں سے اس کی چھڑی اچک لی اور بولی۔

''رحیمے! مرد کا بچہ ہے تو بول...... مجھے ابھی گھر لے جائے گا یا برات کے ساتھ لے جائے گا؟''

پیپل کا جھنڈ ساکت کھڑا رہا، گاؤں کی فضا میں اپلوں کا دھواں اور دھول کا غبار چپ چپیتے گھومتا رہا، دور کسی گھر کے در کے سامنے اکتارہ بجاتے فقیر کی صدا ماحول میں سحر گھول رہی تھی......رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔

''گھر جا......'' رحیم داد نے انگوٹھے سے اپنی پشت کی طرف اشارہ کیا۔ ''گھر جا، آئندہ کبھی مجھے راستے میں نہ روکنا...... ہاں سن، تیرے دروازے پر صرف میری برات آئے گی۔''

اگلی صبح وہ اکھاڑے میں معمول کی ورزشیں اور زور مکمل کرنے کے بعد جب جانے لگا تو استاد نے اسے روک لیا۔ باقی لڑکوں کے جانے کے بعد استاد نے اپنی چھڑی اس کی تھوڑی کے نیچے چبھوتے ہوئے گردن اکڑا دی۔

''بول رحیمے! تیرے دل میں کیا ہے؟''

''استاد جی......!'' رحیمے کا معصوم سا چہرہ اور معصوم معلوم ہونے لگا۔

''بول...... سچ بول'' استاد کے چہرے پر کرختگی تن گئی، وہ بے بس سا ہو گیا۔

''استاد جی'' اس نے ٹھوس لہجے میں رک رک کر کہا ''عشق ہو گیا ہے۔''

استاد نے گھوم کر ایک گھونسہ اس کی ناک پر جمایا۔ خون کے قطرے اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر ٹپکنے لگے۔ استاد نے دوسرا گھونسہ اس کے جبڑے پر رسید کیا اور تڑاخ سے دانت بجنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے پھونک مار کر لبوں پر ٹپکتے خون کے قطرے کو اڑایا۔ استاد نے پھر اس کی پیٹھ اور کمر پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ جب استاد تھک گیا تو پسینے میں شرابور زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے صافے کے پلو سے ناک سے بہتی خون کی دھاروں اور نئے نئے اگے سبزہ خط پر ٹپکتے خون کے قطروں کو صاف کیا اور استاد کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''استاد جی! میرا پہلا عشق دنگل ہے...... یہ تحصیل کا دنگل رحیما جیتے گا، ضرور جیتے گا۔''

پھر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا نہر کی طرف چلا گیا جس کے پل پر کھڑے ہو کر لڑکے سر کے بل پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے نہر میں نہاتی بھینسوں کی دمیں پکڑ کر تیر رہے تھے۔

رحیم داد اور زہرہ کے عشق کا قصہ سارے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور بے شمار معصوم دلوں کا انجانے میں خون ہو گیا...... اگر دل کا خون کرنا قانوناً جرم مانا جاتا تو رحیم داد کی سزا تو سینکڑوں جنموں میں ختم نہ ہوتی...... ان دنوں تیس تیس کوس تک ہر بستی، ہر آبادی اور ہر گھر میں رحیم داد کے

آئندہ دنگل اور رحیم داد اور زہرہ کے عشق کا قصہ کسی ماورائی داستان کی مانند زبان زد عام تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں میں بات کرتے ہوئے سنسنی سی دوڑ جاتی، نوجوان لڑکے حسد کی آگ میں جل جاتے اور نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اپنے خالی خالی دلوں کو ٹٹولتیں۔

دنگل کے دن جیسے جیسے قریب آتے جا رہے تھے، علاقے بھر میں سنسنی اور جوش بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کے گاؤں کے لوگوں نے کئی روز پہلے بیل گاڑیوں، سائیکلوں اور اونٹ گاڑیوں کو سجانا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً جس گاڑی پر رحیم داد نے سوار ہونا تھا اس کی آرائش دیکھنے کے لائق تھی۔ کیلوں کے سبز پتوں کی باڑ بنائی گئی تھی جسے سنہری تاروں اور پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ تختوں پر نرم گدے بچھائے گئے تھے اور رحیم داد کے گلے میں اتنے ہار ڈالے گئے تھے کہ اس کی گردن بھر گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے پختہ سڑک کے پار کھیتوں میں صبح کا انتظار کرتے رہے اور صبح رواں دواں گاڑیوں کے ڈنڈوں سے لپٹ گئے اور باوجود کئی کئی ڈنڈے کھانے کے ہاتھ نہیں چھوڑے اور لڑکیاں شب بھر ارمانوں اور آنسوؤں کے دیپ جلائے پھولوں کے ہار گوندھتی رہیں جو صبح بیل گاڑی کے ڈنڈوں سے لپیٹ دیئے۔ اس روز چوپال میں شب بھر چائے کی دیگیں پکتی رہیں اور کل کے سنسنی خیز مقابلے کی باتیں ہوتی رہیں البتہ رحیم داد شب بھر آرام سے سویا رہا۔ صبح گاڑیوں پر قافلے کی خوراک لادی گئی اور جب یہ بیل گاڑیوں، اونٹ گاڑیوں اور سائیکلوں کا قافلہ روانہ ہوا تو گاؤں کی عورتیں دور تک گیت گاتی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ جب گاؤں کا آخری موڑ کاٹ کر قافلہ پختہ سڑک پر رواں ہوا تو رحیم داد نے دیکھا کہ زہرہ ایک نالی کے بڑے سے تنے کے پیچھے سے نکلی اور اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ رحیم داد کو یقین ہو گیا کہ آج کی کشتی وہ ضرور جیتے گا۔

دوپہر کے قریب یہ قافلہ تحصیل کے صدر مقام پہنچ گیا۔ دنگل کی جگہ ہزاروں کا مجمع تھا۔ ٹینٹ لگا کر اے۔ سی صاحب و دیگر افسران کی نشست گاہ بنا دی گئی تھی اور چھابڑی اور ریڑھی والوں کا ازدحام تھا۔ سہ پہر کے قریب مقابلہ شروع ہوا۔ دوسرا پہلوان پکی عمر کا مہیب الجثہ اور سخت رو تھا۔ وہ سرخ منقش قمیص اور نیلا تہبند جس پر سنہری تاروں کا کام تھا، زیب تن کئے ہوئے تھا۔ وہ اکھاڑے کے بیچ بازو اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور جب اس کے آدمیوں نے اس کا جھلمل کرتا لبادہ اتارا تو اس کے حامیوں نے نعروں اور تالیوں سے قیامت برپا کر دی۔ پہلوان ہونٹوں پر انگلیاں بجا کر ''بھک بھک'' کی

آوازیں نکال کر دعوت مبارزت دینے لگا۔ اس نے نخوت اور نفرت سے کھنکار کر زور وشور سے تھوکا اور پھر وہ پورے میدان میں قوی ہیکل دیو کی مانند چکر لگانے لگا اور لوگوں کے قریب رک رک کر اپنے جسم کے مختلف حصوں کے مسل کو اکڑا اکر نمائش کر رہا تھا اور منہ سے اشتعال انگیز آوازیں نکال رہا تھا۔ ہجوم پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ شور، ہنگامے، نعرے، تالیاں اور فقرہ بازیاں...... اس وقت وہاں صرف ایک کیفیت طاری تھی اور وہ تھی ہیجان اور سنسنی...... رحیم داد نے حسب معمول اپنا نیلا لنگوٹ کسا اور استاد کے پاؤں چھو کر اور اجازت لے کر نپے تلے قدم رکھتا اس کے بالمقابل جا کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کی معصومیت، نوعمری اور گٹھے ہوئے دبلے وجود کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تاسف کا اظہار کیا۔

''یہ بچہ غریب کیوں مرنے کے لئے آ گیا۔''

رحیم داد کے مقابلے کے بعض لڑکے جو اس سے خار کھاتے تھے، انہوں نے بآواز بلند کہا۔

''آج آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے......''

وہ یوں کھڑا تھا جیسے پہاڑ کے سائے میں چیتا جست بھرنے کو تیار کھڑا ہو۔ بڑے پہلوان نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر چیخ کر کہا۔

''تیرے منہ سے ماں کے دودھ کی بو آتی ہے...... جارے تیرے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔'' پورے مجمع پر ایک بھرپور قہقہہ برس پڑا۔ پھر جج صاحب کے مقابلہ شروع کرنے کی گھنٹی بجانے اور ریفری کے پھدک پھدک کر اور اچھل اچھل کر ان کے گرد گھومنے پر مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں پہلوانوں کے حمایتی چیخ چیخ کر حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ڈھول والا ڈھول پیٹ پیٹ کر پسینہ پسینہ ہو رہا تھا جیسے ڈھول پیٹنے کے جوش میں ذرا بھی فرق آیا تو پوری دنیا ایک خوفناک دھماکے سے آپس میں ٹکرا جائے گی۔ دونوں پہلوانوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو جانچا۔ فیکے پہلوان نے اعتماد سے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دبوچنا چاہی لیکن ہاتھ اوچھا پڑا، وہ بجلی کی سی تیزی سے پینترا بدل کر دوسری سمت تھا پھر چھلانگ لگا کر چیتے کی پھرتی سے اس پر حملہ آور ہوا۔ ہزاروں کے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ابھی تو مقابلہ پوری طرح شروع بھی نہ ہوا تھا، آنکھیں مانوس بھی نہ ہوئی تھیں۔ چیخ چیخ کر گلے بیٹھے نہ تھے کہ وہ قوی الجثہ پہلوان چاروں شانے چت زمین پر پڑا تھا۔ ہزاروں کے اس ہجوم میں سوائے تیز تیز سانس لینے کے اور کوئی آواز نہ تھی لیکن وہ دیو ایسا گرا کہ پھر باوجود کوشش کے، اپنے

حامیوں کے جوش دلانے کے اور ریفری کی گنتی گننے کے اٹھ نہ سکا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوا اور رحیم داد کے حمایتی بھنگڑا ڈالتے اکھاڑے میں گھس آئے اور رحیم داد کو کندھوں پر اٹھا کر خوشی اور قوت کا بھرپور مظہر ایک جنگلی رقص دیوانہ وار ناچنے لگے اکھاڑے کی دھول آسمان کو چھو رہی تھی اور پرجوش نعرے اور چیخیں سماعت کو پتھرا رہی تھیں۔ پھر اے۔سی صاحب نے اپنی تقریر میں رحیم داد کی تعریف کی اور کہا۔

''رحیم داد یقیناً رستم ضلع کا اعزاز حاصل کرے گا۔ اس کے بعد رستم پاکستان...... اور پھر مزید کامرانیاں اس کے انتظار میں ہیں۔ پاکستان کو اپنے اس سپوت پر فخر ہے۔'' پھر اسے سند اور پانچ ہزار روپے انعام کے طور پر پیش کئے جو رحیم داد نے جھک کر وصول کئے۔ اے۔سی صاحب سے ہاتھ ملا کر اپنے استاد کے پاؤں چھوئے اور تادیر جھکا رہا۔ استاد اور اس کے باپ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے۔ اس دن دونوں کے گلوں میں پھولوں اور نوٹوں کے اتنے ہار پڑے کہ دونوں کے چہرے چھپ گئے اور اس کے باپ نے پورے مجمع میں کہا کہ آج وہ پھر سے جوان ہو گیا ہے۔ اس رات رحیم داد کے گھر کچے دودھ کے پیالے اور دیسی گھی کے حلوے کی رکابیاں مہمانوں کو پیش کی جاتی رہیں اور تیز تمباکو کے حقے بار بار تازہ کئے جاتے رہے اور نوجوان خوشی سے سرشار رقص کرتے رہے۔ رحیم داد کے اس دنگل کو دیہی علاقوں کے مخصوص گمنام شاعروں نے بڑے ولولہ انگیز انداز میں منظوم کیا اور کھیتوں کو پانی دیتے ہوئے مردوں اور شادی بیاہ پر لڑکیوں نے لہک لہک کر گایا۔ رحیم داد کی شخصیت کسی افسانوی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور اب لوگوں کی تمام تر دلچسپی چند ماہ بعد ضلع کی سطح پر منعقد ہونے والے دنگل پر مرکوز ہو گئی تھی جس میں رحیم داد کا مقابلہ رستم ضلع سے ہونے والا تھا۔

اس دن رحیم داد کے باپ نے اپنا سفید براق کرتا پہنا، کلف لگی دو طروں والی پگڑی سر پر سجائی، چمڑے کے جوتے کو کچی گھانی کے تیل سے چپڑا اور زہرہ کے باپ کے پاس گیا۔ زہرہ کا باپ بیٹھک میں بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے رحیم داد کے والد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور گھر کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

''زہرہ کی ماں! اے سنتی ہو، چودھری کے لئے لسی کا کٹورہ مکھن کا پیڑا ڈال کر بھیجو۔''

رحیم داد کے باپ نے پھول کاڑھے سفید سخت تکیے پر کہنی ٹکاتے ہوئے کہا۔

''تیرے گھر کی لسی اور مکھن بھی ضرور پیوں گا لیکن پہلے جس مطلب سے آیا ہوں وہ خیرات مجھے

بخش دے......زہرہ کے رشتے کی آس لے کر آیا ہوں۔"

اللہ دین نے منہ سے حقے کی نے اگل دی، اس کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"چودھری کرم داد! تمہارا مجھ سے یہ بات کہنا جائز نہ تھا۔ تم جانتے ہو کہ تم جٹ ہو اور ہم راجپوت......اور راجپوت مر تو سکتا ہے لیکن بیٹی کبھی برادری سے باہر نہیں دیتا۔ تمہارے بیٹے نے ہمیں پہلے ہی بہت بدنام کر دیا ہے۔ میرے آٹھ بیٹے ہیں اور آٹھوں جیدار ہیں، تم نہیں جانتے کہ میں نے انہیں کیونکر خون خرابے سے روک رکھا ہے ورنہ...... ورنہ ہم بے غیرت نہیں ہیں۔" پھر اس کی طرف منہ پھیر کر بولا "اب تم میرے گھر سے جیسے آئے تھے، ویسے ہی لوٹ جاؤ......ابھی میرے بیٹے کھیتوں سے واپس آ جائیں گے اور تمہیں یہاں دیکھ کر برداشت نہ کر پائیں گے۔"

کرم داد نے نرمی سے کہا "مگر اللہ دین! یہ تو بچوں کا معاملہ ہے ذرا تم......"

"اب ایک لفظ اور نہ کہنا" پنجابی کسان کا مخصوص اکھڑ پن اس کی بھنوؤں اور مضبوط جبڑوں پر برسنے لگا "میں اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے کو دے چکا ہوں......کل ہی زبان دی ہے اور بہت جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا......اور ہاں، اپنے بیٹے سے بھی کہہ دینا کہ اپنی حد میں رہے، ہوگا رستم ضلع لیکن عزت کے معاملے میں چوہا بھی شیر ہوتا ہے۔"

اللہ دین کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں لرزنے لگی تھیں۔ کرم داد اپنا حقہ اٹھا کر واپس چلا آیا۔ رحیم داد نے چھپری میں لیٹے لیٹے فاختاؤں اور لالیوں کے پروں کو اڑان بھرتے اور پھر کھیتوں میں پھیلتے دیکھا جو مکئی کے کھیتوں میں ڈبکیاں لگا کر بھر جاتے اور ذرا سی آہٹ پا کر پرے کے پرے فضا میں گھومنے لگتے۔ پھر تیسرے پہر کی مٹیالی دھوپ میں دھول کے اڑتے غبار میں چلتا ہوا اس کا باپ آتا دکھائی دیا۔ رحیم داد اپنے لمبے قد کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا سر چھت کی سیاہ کھردری لکڑیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ کرم داد نے ایک ہاتھ میں حقے کو پکڑا اور دوسرے سے اس کے کندھے کو مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔

"جاٹوں میں دنیا کی حسین سے حسین لڑکیاں بھری پڑی ہیں تو کسی جاٹ لڑکی کی طرف اشارہ کر، صرف اشارہ۔"

رحیم داد کے معصوم سے چہرے پر عجیب سی کرختگی آ گئی اور رخساروں کی ہڈیاں نوکیلی ہو کر ابھر

آ ئیں اور بازوؤں اور سینے کی مچھلیاں تن کر لرزنے لگیں۔ بھوری بھینس محبت سے اس کی آستین چاٹنے لگی تھی۔ اس نے پوری قوت سے گھونسہ اس کی گردن میں جمایا، بھینس تیورا کر پیچھے ہٹی اور وہ گردن کی پھولی پھولی نسوں میں ہانپتا ہوا اکھاڑے کی سمت چل پڑا۔ اکھاڑے میں تمام لڑکے مختلف ورزشوں میں مصروف تھے۔ آج غالباً وہ دیر سے پہنچا تھا ورنہ اکھاڑے میں قدم رکھنے والا وہ پہلا جوان ہوتا تھا اور استاد اس کی طرف دیکھے بغیر جان جاتا تھا کہ رحیم داد آ گیا ہے۔ وہ خاموشی سے جا کر استاد کے پاس بیٹھ گیا۔

''استاد جی! آج پہلے زور ہوگا۔''

وہ استاد کا جواب سنے بغیر جا کر اکھاڑے کے وسط میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ استاد نے اسے بغور دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ وہ نذیرے کو للکارتا ہوا اس پر پل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے مٹی کی مٹھیاں نذیرے کے منہ اور ناک کے راستے حلق میں ٹھنس چکی تھیں اور وہ بھیگے ہوئے مریل کتے کی مانند زمین سے چپکا تھا۔ اسی دن نذیرے کی دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں اور وہ آئندہ کبھی زور کرنے کے قابل نہ رہا۔ بعد میں وہ آٹھوں بھائی تلواریں، بلم اور چھرے اٹھا کر لڑنے بھی آئے لیکن استاد نے بیچ بچاؤ کروا دیا کہ یہ تو کھیل ہے، دو پہلوانوں کا مقابلہ تھا اور پہلوانی میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن وہ آئندہ سبق سکھانے کی دھمکیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔

اسی رات وہ اپنے کوٹھے کی چھت پر چارپائی پر لیٹا تھا۔ چاند سیدھا کوٹھے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا، ہر شے دودھیا دھند میں چھپی تھی اور کتوں کے بھونکنے کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کبھی کبھی کھیت کو پانی لگانے والے کسان کے ٹپے گانے کی آواز آ جاتی تھی۔ نیچے صحن میں اس کے والدین بے خبر سو رہے تھے اور جانوروں کے سانسوں کی آوازیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ اس وقت تک وہ آدھی نیند پوری کر چکا ہوتا لیکن آج زندگی میں پہلی بار نینداس کی آنکھوں کو خالی چھوڑ گئی تھی اور خالی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ وہ اٹھا اور منڈیر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ نیچے گلی سنسان پڑی تھی۔ کہیں کہیں کانچ کے ٹکڑے آدھے آدھے زمین میں دبے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے اور کتے گوبر کے ڈھیروں پر لوٹ رہے تھے۔

تبھی ایک نو دس سالہ لڑکے نے اسے نیچے سے پکارا۔ اس نے جھک کر دیکھا تو لڑکا کیکروں کے

جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہاں تمہیں زہرہ بلا رہی ہے۔''

وہ چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔ کپاس کے چھوٹے چھوٹے پودے سبز ہموار چادر کی مانند کھیتوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ لمبے لمبے مضبوط بازو لٹکائے منڈیر پر چل رہا تھا یوں کہ جیسے قوت و دلکشی کا مظہر کوئی مشینی انسان رواں دواں ہو۔ زہرہ کیکر کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ اس کا لمبا قد اور لمبی چٹیا نیم تاریکی میں پُر اسراری معلوم ہوتی تھی۔ رحیم داد اس سے دو فٹ ادھر ہی رک گیا اور اس کے سر سے اوپر ہی اوپر دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں آئی ہو؟''

''تو مجھ سے ناراض ہے رحیمے؟''

رحیم داد نے سبز پتوں کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا۔

''تو چل پھر...... مجھے ابھی گھر لے چل میری ساس کے پاس!'' زہرہ نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''تیری ساس تو اب کوئی اور ہے۔'' اس نے جھنجھوڑ کر اپنا بازو چھڑایا۔ ''بشیر بھی اچھا تگڑا جوان ہے۔''

''مت نام لے میرے سامنے......''

''میں مر جاؤں گی رحیمے! لیکن کسی اور کی ڈولی میں نہیں بیٹھوں گی...... نہیں رحیمے نہیں...... تو زہرہ کو سمجھا ہی نہیں۔''

وہ اپنا سر تنے سے پٹخنے لگی۔ رحیم داد اپنے مضبوط قدموں پر کھڑا رہا۔

''تو پھر کل بشیرے کی لاش تیرے قدموں میں لا کر پھینک دوں گا۔'' اس کا بے تاثر چہرہ بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''نہیں'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''نہیں رحیمے! تم یہ نہیں کرو گے...... وہ بدبخت مر جائے گا اور تو جیل چلا جائے گا...... نہیں رحیمے! تو جیل نہیں جائے گا، تو تو رستم ضلع ہو گا۔ تیرا یہ خوبصورت جسم جیل کی چکی پیسنے کے لئے نہیں ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں اس کی قمیض کے دامن کو کھینچ رہی تھی۔ ''وعدہ کرو رحیمے! میرے

ساتھ وعدہ کر کہ تو یہ نہیں کرے گا۔''

''تو گھر واپس جا...... اس طرح تیرا آنا مجھے پسند نہیں آیا۔''

وہ واپس اسی راستے پر چلنے لگا جدھر سے آیا تھا۔ اس کا مضبوط چٹان کا سا وجود اندر ہی اندر پٹخنیاں کھا رہا تھا۔'' پھر پتہ نہیں یہ بات کس طرح ہر سو پھیل گئی کہ رحیم داد بشیرے کو قتل کر ڈالے گا۔ بشیرے کی ماں نے بیٹے کو گھر میں تقریباً قید کر لیا اور کئی بار اس رشتے کو ختم کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا لیکن بشیرے نے اسے بے غیرتی گردانا اور اپنی منگ چھوڑنے کی نسبت مر جانے کو ترجیح دینے کا روایتی اظہار کیا اور آخر کار ایک اندھیری شب خونی پل پر دونوں جوانوں کا مقابلہ ہو گیا۔ یہ پل اس لئے خونی مشہور تھا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے یہاں کوئی نہ کوئی آدمی ڈوب کر مرتا تھا اور کئی بار سر کٹی لاوارث لاشیں اس کے نیچے سے گزرتے دیکھی گئی تھیں۔ بڑی خوفناک روایتیں اس سے وابستہ تھیں اور لوگ یہاں آنے سے گریز کرتے تھے۔ اس روز بشیرا اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود شہر چلا گیا تھا۔ اگرچہ اسے سہ پہر تک واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن راستے میں سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور کئی گاؤں پار جا کر پنکچر لگ سکا۔ تبھی نہر کے پل کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے رات کی تاریکی نے آ لیا تھا۔ وہ اندر سے خوفزدہ تھا اور اپنے اندر کے خوف کو دبانے کے لئے اونچے سروں میں ہیر گا رہا تھا۔ اس کی پر سوز آواز نہر کے خاموش پانیوں، ساکن درختوں اور کپاس کے گھنے پودوں میں سرسرا رہی تھی۔ تبھی رحیم داد نے پل کے جنگلے سے چھلانگ لگا کر سائیکل کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سائیکل کا اگلا پہیہ گھوم کر فضا میں کھڑا ہو گیا۔

''نیچے اتر......'' رحیم داد کی آواز دوٹوک تھی۔

''میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا اور میری تم سے کوئی دشمنی بھی نہیں...... میری ماں نے زہرہ سے میری منگنی کی ہے اور اب وہ میری منگ ہے۔'' لڑکے کے نرخرے میں لفظ اٹک رہے تھے، خوف اس کی آنکھوں میں گھس آیا تھا اور پورا جسم موت کے سرد لمس کو محسوس کر رہا تھا۔

''عورتوں کی طرح بہانے بازی مت کر...... نیچے اتر، آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔'' رحیم داد نے ایک ہاتھ سے اسے گردن سے دبوچا اور نیچے گھسیٹ لیا۔ سائیکل کے پہیے چرخی کی مانند گھومتے رہ گئے۔

''اگر تو مرد کا بچہ ہے تو بھاگنے کی کوشش نہ کرنا...... تو جانتا ہو گا کہ اس پورے علاقے میں مجھ سے زیادہ تیز رفتار کوئی جوان نہیں ہے...... آؤ مردوں کی طرح مقابلہ کریں۔''

اس نے جھٹکا دے کر اس کی گردن کو چھوڑ دیا۔لڑکے کی آنکھیں خوف سے باہر ابل آئی تھیں۔

''میں خالی ہاتھ ہوں'' لڑکا منمنایا۔

''یہ لے۔''

رحیم داد نے اپنی لوہے کا خول چڑھی تیل سے چپڑی چھڑی اس کی طرف اچھالی۔لڑکے نے ہوا میں چھڑی اچک لی اور ماہر گتکا باز کی طرف اچھل کر حملہ آور ہوا۔رحیم داد نے اپنے سر اور سینے کو بازوؤں سے ڈھانپ کر وار روکا۔لڑکا اچھل اچھل اور کود کود کر بے تحاشا وار کرنے لگا جن میں سے اکثر خالی جا رہے تھے یا وہ اپنے بازو پر روکتا یا ہاتھوں میں پکڑ کر ڈنڈا چھوڑا دیتا۔دھول کا غبار اڑ رہا تھا اور چگادڑیں ان کے سروں پر پرواز کر رہی تھیں۔بشیرا جارحانہ انداز میں وار کر رہا تھا لیکن رحیم داد مضبوط چٹان کی مانند کھڑا تھا۔لڑکا جب وار کرتے کرتے ہانپ گیا تو جھنجھلا کر پل کے جنگلے کے ساتھ لگ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

''بس یہی جی داری تھی......''

رحیمے نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔غضب ناک ہو کر فضا میں جست بھری اور دونوں ٹانگیں لوہے کی سلاخوں کی مانند اس کے سینے پر جمائیں تو وہ جنگلے کے اوپر سے لڑھکنیاں کھاتا ہوا نہر میں جا گرا۔ رحیمے نے اسی لمحے کود کر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر باہر نکالا اور پل کے کھردرے پتھروں پر اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگا۔اس کی ہڈیاں پتھروں سے یوں ٹکراتیں جیسے لوہا بج رہا ہو۔پھر اس کی گردن ہاتھوں میں دبوچ کر مروڑنے لگا۔اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔چہرہ اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔قریب تھا کہ اس کی گردن بے دم ہو کر ڈھلک جائے کہ رحیم داد نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور نفرت سے زمین پر تھوکا، پھر دھول میں لتھڑے اس نیم مردہ بھتنے کو پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

''یہ تیرا پہلا سبق ہے......اگر اب بھی باز نہ آیا تو اگلا سبق آخری ہوگا۔''

وہ نہر کے کنارے پر آ گیا۔پانی سے منہ ہاتھ دھویا پھر اس نے اپنا جوتا دھو کر کنارے پر رکھا اور پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں یوں گھورنے لگا جیسے گھور تاریکی میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔

آدھی رات کو جب پچھلی تاریخوں کا چاند درختوں میں الجھ رہا تھا تو کھیتوں کو پانی دینے والے کسان اس نیم مردہ لڑکے کو آگ کی حرارت دے کر اور اس کی چوٹوں پر گرم پتھروں سے ٹکوریں کر کے

اسے ہوش میں لائے لیکن لڑکا اتنا خوفزدہ تھا کہ اس کی زبان سے رحیم داد کا نام نہیں نکلا اور کئی روز تک اس نے سر کے زخموں کو نیچی سی پگڑی باندھ کر چھپائے رکھا لیکن کسی سے ذکر نہیں کیا۔

بھادوں کی ایک نم آلود رات جب گاؤں کے سب لوگ سوانگ دیکھنے گاؤں کے باہر جمع تھے اور خود رحیم داد کے والدین بھی شادی والے گھر مدعو تھے اور ابھی تک واپس نہ لوٹے تھے، رحیم داد اکیلا چھت کی منڈیر پر بیٹھا دور سے آتے قہقہوں اور باتوں کے شور کو سن رہا تھا۔ گیس اور لیمپ کی روشنیوں میں سرسراتے انسانی ہیولے مضحکہ خیز حرکات کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ پورے چاند کی چاندنی میں نہایا چپ چاپ بیٹھا عجیب سا شور اپنے اندر محسوس کر رہا تھا تبھی اسے صحن میں کھڑکا سا سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی زہرہ کی آواز آئی۔

''رحیم داد''

رحیم داد کود کر نیچے آ گیا۔ زہرہ کپڑوں کی پوٹلی بغل میں سے نکال کر چارپائی پر رکھ چکی تھی۔

''رحیمے میں آ گئی ہوں...... ہمیشہ کے لئے'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

وہ آہنی قدموں پر گھوم کر اس کی جانب پشت کیے کھڑا ہو گیا۔

''اگلے جمعہ میرا نکاح طے پایا ہے...... خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے مجھے رخصت کر دیا جائے گا اور آج منگل ہے۔''

''یہ سب کب ہوا؟'' تیورا کر اس نے رخ اس کی طرف پھیرا۔

''آج ہی...... آج ہی پھوپھی آئی تھی۔ اگلی کوٹھری میں یہ سب طے پایا ہے۔ مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا لیکن بڑی بھابی نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔'' وہ سسکنے لگی۔

''پھر......؟'' جیسے اس نے خود سے سوال کیا اور اس کا مضبوط بدن تن گیا۔

''آج سب گھر والے سوانگ دیکھنے گئے تھے...... تمہیں شاید نہیں پتہ، مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا۔ آج میں اور بڑی بھابی اکیلے تھے، اس نے مجھے نکلنے میں مدد دی...... بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں۔''

رحیم داد اس کی طرف پشت کیے کھڑا ہو گیا اس کے آہنی مسل پھڑ پھڑا رہے تھے اور کشادہ پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو'' زہرہ نے اٹھ کر اس کا بازو جھنجھوڑا ''اب میں مر سکتی ہوں لیکن واپس نہیں جاؤں گی۔''

زہرہ نے اس کے بازو سے رخسار ملتے ہوئے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور سسکیاں بھرنے لگی۔

رحیم داد نے چھپری کی کالک زدہ چھت سے کپڑے میں لپٹی لاٹھی باہر کھینچی جس کے سروں پر پیتل چڑھا تھا۔ چھپری کی چھت سے بہت سی راکھ جھڑ کے چوکے پر بکھر گئی پھر اس نے لاٹھی بڑھا کر چارپائی پر سے اپنا سلک کا کرتا اٹھایا جس کے ساتھ سونے کے بٹن جھنجھنا اٹھے اور کرتا پہنتے ہوئے بولا:

''آؤ......''

دونوں کپاس کے کھیتوں کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ کپاس کے گھنے پودے جو کمر سے ذرا نیچے تھے اور جن پر ابھی پھول نہیں آئے تھے، ایک سرسراہٹ سی پیدا کرتے اور درختوں میں چھپے پرندے پھڑ پھڑانے لگتے۔ کھیتوں میں سوئے کئی کسانوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پہچان کر پوچھا۔

''رحیم داد! خیر تو ہے......؟''

لیکن کوئی جواب نہ پا کر اس کے پیچھے چلتی سیاہ چادر میں لپٹی عورت کو حیرت سے دیکھا۔ دودھیا چٹکی ہوئی چاندنی میں جھکے جھکے درختوں اور گہرے سبز کھیتوں کے درمیان جاتے راستے پر تقریباً پانچ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک اجنبی گاؤں میں داخل ہوئے جس کے کتے اجنبی لوگوں کو اپنی سرحد میں پا کر بے تحاشا بھونکنے لگے۔ گاؤں کے شروع میں ہی وہ ایک حویلی نما گھر کے سامنے رک گئے۔

''فضل دین......''

رحیم داد نے تقریباً پانچ فٹ اونچی دیوار کے اوپر سے سر نکال کر آواز دی۔ احاطے میں موجود دونوں خونخوار کتے زور زور سے بھونکنے لگے اور دوسرے مویشی رسیاں کھینچ کر اپنے کھونٹوں کے گرد گھومنے لگے۔ فضل دین کا ہاتھ اپنے بستر کے نیچے رکھے کلہاڑے پر پڑا، پھر کلہاڑی کا پھل بلند کرتے ہوئے پوچھا ''کون ہے؟'' اور دیوار کے اوپر سے جھانکتے چہرے کو بغور دیکھا پھر پہچان کر جھٹ سے کیکر کے تختوں کا بنا بڑا سا دروازہ کھول دیا اور رحیم داد کو گلے سے لگا لیا مگر اس کے پیچھے بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی عورت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ رحیم داد کو ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

''بات کیا ہے یار؟''

''نکاح کرنا ہے اس عورت سے...... مدد کرو گے میری؟''

''یار! کمال کرتے ہو......'' فضل دین نے اس کا کندھا تھپتھپایا

''اپنے یار پر بھی بھروسہ نہیں تمہیں؟''

پھر چارپائیوں پر بے سدھ سوئے اپنے چھوٹے بھائی اور نوکر کو کلباڑی کے دستے کے ٹھوکے دے کر اٹھایا تو دونوں نوجوان آنکھیں ملتے ہوئے صورتحال کو سمجھنے کی کوشش میں عجیب احمق سے لگ رہے تھے۔ فضل دین نے اپنے بھائی سے کہا'' جاؤ اپنی بھابیوں کو جگا لاؤ۔'' پھر رحیم داد کی طرف آنکھ میچ کر بولا'' آج دونوں کی خوب ٹھکائی کی ہے لیکن چلو، اب منا لیتے ہیں انہیں...... تم لوگ بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔''

فضل دین کی دونوں بیویاں ایک ستاروں سے بھرا جھلمل کرتا سرخ دوپٹہ لائیں اور زہرہ کی سیاہ چادر اتار کر اسے اوڑھا دیا اور دونوں اس کے دائیں بائیں پاؤں لٹکا کر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ نوکر لالٹین جلا لایا اور ایک کھونٹی سے ٹانگ دی۔ فضل دین جب واپس آیا تو اس کے ساتھ نکاح خواں تھا۔ بس آدھے گھنٹے کے اندر اندر دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ عورتوں نے دونوں کو دودھ پلایا، ہلکا پھلکا مذاق کیا اور دبی دبی ہنسی ہنستی رہیں۔ اب چاند چھپ گیا تھا اور اندھیرا جانوروں کے باڑے میں پھیل گیا تھا اور قوی الجثہ جانوروں کے سائے مہیب ہو گئے تھے۔ سبز چارے، کھلی، بھوسے اور گوبر کی ملی جلی بو سارے صحن میں پھیلی تھی۔ لالٹین کی زرد جھلملاتی لو میں زہرہ کا چہرہ دمک رہا تھا اور رخساروں پر خون کے ذورے سے دوڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب رحیم داد اپنے محسن کا شکریہ ادا کر کے چلنے کے لئے کھڑا ہوا تو فضل دین نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔

''باولا ہوا ہے یار؟'' پھر قریب منہ لا کر پُر مزاح انداز میں بولا۔'' راجپوتوں کی لڑکی اڑا لایا ہے جو آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے اور اب ان کے سامنے جا کر ان کے سینے پر مونگ دلنا چاہتا ہے۔'' رحیم داد کے ہونٹوں کے کونے پھیل گئے۔'' تم دونوں میرے مہمان ہو اس وقت تک جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں اور مجھے یقین نہ ہو جائے کہ تم دونوں محفوظ ہو''۔ فضل دین نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''لیکن یار! لوگ سمجھیں گے کہ میں اسے لے کر بھاگ گیا ہوں۔'' رحیم داد نے ٹھوس آواز میں

کہا۔

''یہ کوئی ذلت کی بات نہیں...... نکاح کیا ہے تم نے اس عورت سے جو تم سے نکاح کرنا چاہتی تھی...... یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔''

پورا علاقہ ''کیا ہوگا'' کے ہیجان خیز انتظار میں جکڑا تھا۔ چوپال میں، بیٹھکوں میں، دکانوں کے تھڑوں اور تنور پر ایک ہی موضوع زیر بحث تھا۔ کسی نئی اطلاع کی کھوج میں کسی نئی خبر کی شنید میں، وتر خشک ہو رہے تھے۔ فصلوں میں جئی اور دی سٹی بڑھ آئی تھی۔ چرنے کے تکلے پر چڑھا گوڑھا پورا ہی نہ ہو پا رہا تھا۔

رحیم داد اور زہرہ کو فضل دین کے پاس رہتے ہوئے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ گاؤں سے طرح طرح کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ کرم داد نے کئی پیغام بھجوائے تھے کہ ابھی گاؤں کا رخ نہ کرنا یہ لوگ مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ زہرہ کا باپ پنچایت لے کر فضل دین کے ڈیرے پر آیا اور بازو لے جانے کا تقاضا کیا لیکن فضل دین نے صاف بتا دیا کہ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے اور دونوں اس کے مہمان ہیں، وہ اپنے مہمانوں کو کسی قیمت پر کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔ اب انہیں چاہیے کہ اچھے بزرگوں کی طرح دونوں کے سروں پر دست شفقت رکھیں لیکن وہ قتل و غارت کی باتیں کرتے واپس چلے گئے...... رحیم داد ان آٹھ دنوں میں اس پابند زندگی سے سخت اوب چکا تھا، اسے لگتا تھا جیسے وہ عورت بن گیا ہے لیکن وہ باہر جا کر مرنا بھی نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بار زہرہ سے کہا تھا۔

''عورت مرد کو بزدل بنا دیتی ہے...... استاد درست کہتا تھا، عورت پہلوان کی موت ہے۔''

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ صرف ڈیڑھ مہینہ بعد اس کا مقابلہ رستم ضلع سے ہوگا اور ایسی زندگی جیسی کہ وہ گزار رہا تھا، اس کا ایک ایک دن اسے رستم ضلع کے اعزاز سے دور لے جا رہا تھا۔ کئی بار وہ سخت ہیجانی کیفیت سے دوچار ہو جاتا اور زہرہ اور فضل دین سے لڑ پڑتا۔

''اس طرح چوہے دان میں جینے سے تو مردوں کی طرح میدان میں مرجانا بہتر ہے۔ یہ...... زندگی ہے کہ بچہ جننے والی عورتوں کی طرح دن رات ٹانگیں پسار کر پڑے رہو...... تم جانتے ہو کہ اگلے مہینے میرا دنگل ہے اور میں ہر قیمت پر اسے جیتنا چاہتا ہوں۔'' وہ کمرے میں چکر لگاتے ہوئے بازو جھٹک جھٹک کر اور پاؤں پٹخ پٹخ کر بولتا چلا جاتا۔ ''او! فضل دین! تم نہیں جانتے پہلوان کے لئے اس طرح چار

دیواری میں قید ہو کر فارغ بیٹھنا موت ہے۔ مجھے اپنے گھر جانے دو، میں نے کوئی جرم نہیں کیا، نکاح کیا ہے..... دیکھا جائے گا، جو ہوگا۔ تم مجھے بزدل سمجھتے ہو..... میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ بیسیوں کو بیک وقت زیر کر سکتا ہوں..... علاقے میں کون مائی کا لال ہے جو رحیم داد کو شکست دے سکے گا!''

اس کی لال انگارہ آنکھوں سے خون چھلکنے لگتا اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آتیں۔ وہ بار بار مٹھیاں بند کرتا اور کھولتا، اس وقت اس کا پورا وجود ایک اضطراری کھچاؤ میں ہوتا۔

''یار میرے دماغ میں ایک تجویز ہے'' فضل دین نے اس سے کہا۔

''کیا.....'' رحیم داد نے بیزاری سے جواب دیا۔

''ادھر شہر میں اپنا ایک یار رہتا ہے۔ ایک کارخانے میں بڑا افسر لگا ہوا ہے۔ تمہیں اس کارخانے میں کام پر لگا دیتے ہیں اگرچہ کہاں تم اور کہاں کارخانے کی نوکری..... لیکن یونہی چند دن کے لئے، جب تک یہ آگ ٹھنڈی نہ ہو جائے..... وہاں تم آزادانہ گھومنا پھرنا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکے گا کہ تم کہاں ہو۔ میرے ایک اور یار کا وہاں ایک مکان خالی پڑا ہے وہاں تم رہنا شروع کر دو۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن تمہارا پتہ کرتا رہوں گا۔''

رحیم داد کو اگرچہ یہ نوکری دوکری کا چکر ہرگز پسند نہ تھا لیکن اسے یہ طمانیت حاصل تھی کہ وہ قیدیوں کی سی اس زندگی سے نجات پائے گا اور شہر کے اکھاڑے میں جانا شروع کر دے گا اور اپنی مشق جاری رکھے گا..... وہ شہر والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ زہرہ کو تو بس رحیم داد کا قرب درکار تھا، چاہے وہ زندگی قید خانے میں گزارے یا ویرانے میں..... وہ اس کے کپڑے دھوتی اس کے لئے کھانا پکاتی، جوتے صاف کرتی..... اس کے بس میں نہ تھا کہ وہ اپنی پوروں میں دل کے تمام ارمان گوندھ کر اور جگر کا تمام خون نچوڑ کر اس کے تمام کام کیا کرے۔

اگرچہ موسم تبدیل ہو رہا تھا لیکن اس چھوٹے سے کمرے میں بے تحاشا گرمی اور مچھروں کی بھرمار تھی تبھی وہ کھلی فضاؤں کے آزاد پنچھی گھٹن محسوس کرتے تھے لہٰذا انہوں نے رات کو چھت پر سونا شروع کر دیا تھا۔

وہ رات گنگ تاریکی میں لپٹی تھی سکوت اور خاموشی نے سارے ماحول کو بے آواز کر دیا تھا کہ تبھی کوٹھے کی پختہ منڈیر سے ایک ہیولا سا ابھرا جس کے ہاتھ میں تیز دھار والا خنجر تھا جو تاریکی میں بھی

چمک رہا تھا، اور جس کی قوسی دھار سے شرارے سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ چھت کی سطح کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا رحیم داد کی چارپائی کے قریب آ گیا۔ پھر وہ گھٹنوں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھا اور پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی سانس تک سادھے ہوئے تھا۔ رحیم داد کے صحت مند چوڑے چکلے سینے کا زیر و بم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پرکشش چہرے پر شگفتگی اور زندگی گنگنا رہی تھی اور مضبوط گٹھے ہوئے جسم کے پٹھے سوتے میں بھی کسے ہوئے تھے۔ اس کے سرہانے کھڑے بے حس و حرکت ہیولے میں جنبش پیدا ہوئی، اس کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور خنجر کی تیز دھار رحیم داد کے صحت مند سینے میں دل، پھیپھڑوں اور پسلیوں کو تڑخ تڑخ کاٹتی ہوئی اندر گھس گئی۔ رحیم داد کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے جیسے فضا میں کچھ پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ قاتل نے پوری قوت سے خنجر باہر کھینچا تو خون کا فوارہ سا پھوٹ نکلا۔ یکدم اس کے دونوں بازو کٹی شاخ کی طرح بے جان ہو کر نیچے گر گئے۔ قاتل کو جھٹکا لگا اور وہ پچھلے قدموں پر دھڑام سے گرا، زہرہ کے چہرے پر جیسے خون کی پچکاریاں سی چھوڑ دی گئیں وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے نیم غنودگی میں آنکھوں میں گھسے خون کے قطروں کو پوروں سے ملا۔ پچھلی تاریخوں کا زرد رو چاند منڈیر سے جھانک رہا تھا اور رحیم داد کے سینے سے ابلتا گرم گرم سرخ خون ساری چھت پر پھیل رہا تھا۔ تازہ تازہ خون سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اس کی گردن ایک طرف لٹکی تھی۔

''رحیم داد......''

زہرہ کے سینے سے ایک دردناک چیخ اٹھی لیکن لبوں پر دم توڑ گئی۔ نذیرا، اس کا سگا بھائی ہاتھ میں خون آلود خنجر پکڑے منڈیر سے پاؤں لٹکائے نیچے چھلانگ لگانے کے لئے جسم کو تول رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کا پھندا بنا کر اس کے گلے میں ڈال کر اسے واپس چھت پر کھینچ لیا اور جنونی قوت کے ساتھ دوپٹے کو بل دے کر اس کی گردن کے گرد مروڑنے لگی۔ نذیرے کا جسم پسینے میں تربتر تھا اور وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''زہرہ......تو میری بہن ہے میں نے باپ کو قول دیا ہے کہ تجھے ہرگز کوئی گزند نہ پہنچے گا......چل میرے ساتھ گھر چل......''

وہ اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے چیخی۔

''تو نے رحیم داد کو مار دیا ہے بزدل چوہے......سوئے ہوئے شیر پر حملہ کیا، اسے للکار کے مارتا تو

وہ تجھے چٹکی میں لے کر مسل کے نہ رکھ دیتا۔''

نذیرے کی آنکھیں باہر ابل آئی تھیں اور نرخرے کی ہڈی ہاتھ برابر ابھری ہوئی تھی اور وہ اس بپھری ہوئی شیرنی کے سامنے بے بس ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے بمشکل یہ لفظ برآمد ہو رہے تھے۔

''میں تجھے زخمی نہیں کرنا چاہتا۔ تو میری بہن......''

چھت پر گھسٹتے ہوئے اس کا نیم برہنہ جسم چھل گیا تھا۔ خنجر کے دستے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ گردن کی رگیں رسیوں کے برابر ابھر آئی تھیں اور گردن ڈھلک رہی تھی۔ اس نے خنجر کے دستے پر آخری قوت مجتمع کی اور زہرہ کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ زہرہ کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ نذیرے نے آخری قوت لگائی اور اس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر نیچے چھلانگ لگا گیا۔ زہرہ نے اپنے پیٹ میں پیوست خنجر کو پوری قوت سے کھینچ کر باہر نکالا تو ساتھ ہی خون کا فوارہ بھی اُبلا جو رحیم داد کے چہرے کو گل رنگ بنا گیا۔ لیکن اس کے پاس کچھ دیکھنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بارہ فٹ بلند چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی نیچے گرتے ہی اس کے پیٹ کا زخم کھل گیا اور خون اور پانی میں لپٹا انتڑیوں کا سفید سا گچھا باہر ابل پڑا۔ اس نے انتڑیوں کے گچھے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ میں ٹھونسا، اوپر کس کر دوپٹہ باندھا اور ہاتھ میں خنجر پکڑے پوری رفتار سے نذیرے کے پیچھے بھاگنے لگی جو اس سے کچھ فاصلے پر بار بار ٹھوکریں کھا کر گر رہا تھا۔ بیمار سے زرد چاند کی روشنی میں لیٹے کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ بھاگتی چلی جا رہی تھی، خون کی دھاریاں پورے راستے پر بل بناتی بکھر رہی تھیں۔ کئی بار وہ نذیرے کے بہت قریب پہنچی اور اسے خنجر کی ضرب بھی دی۔ اس کا پورا پیٹ چاک تھا اور باہر بہتی ہوئی انتڑیوں اور جسم کا خون نکل جانے کے باوجود وہ کسی غیر مرئی قوت سے دوڑ رہی تھی۔ ایک طاقت اس کے ہاتھوں میں بھر گئی تھی جو خنجر کے دستے پر اس کی گرفت کو فولادی کر گئی تھی۔ نذیرا گرتا پڑتا قریبی تھانے کی عمارت کے اندر چلا گیا تو وہ بھی پیچھے داخل ہوئی نذیرا تھانے دار کی میز کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ جنونی انداز سے اس پر حملہ آور ہوئی مگر سپاہیوں نے اسے گرفت میں کر لیا...... اس نے خون سے لت پت ہاتھ تھانے دار کی میز پر پھیلا دیئے جن میں خنجر دبا تھا اور صاف اور واضح آواز میں بولی۔

''تھانے دار جی! یہ رحیم داد کا قاتل ہے۔''

اس کا سر میز سے ٹکرایا...... پیٹ کھل گیا، تمام انتڑیاں باہر ابل پڑیں اور وہ بے حس ہو گئی......

مٹھیوں میں ابھی تک خنجر بھنچا تھا، بعد میں کئی سپاہیوں نے بڑی مشکل سے خنجر اس کی گرفت سے نکالا اور تھانے دار نے مبہوت آواز میں کہا۔

''بڑی جی دار عورت تھی۔''

اور پھر اس کا بے جان جسم سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔

اسیرانِ ذات

ایک انجان شخص کے لئے ایک بڑے اور اجنبی شہر میں ایک گھر تلاش کرنا گویا جوئے شیر لانا ہے لیکن خلاف توقع مجھے رحمٰن چچا کا گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئی کیونکہ چچا ان لوگوں میں سے تھے جنہیں شہر کے بارے میں ذرا سی بھی معلومات رکھنے والے لوگ بخوبی جانتے ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور تو اپنے ذہن میں ایسی جگہوں کا اندراج کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں۔ گو چلتے وقت ابا نے مجھے چچا کا وہ خط تھما دیا تھا جس میں انہوں نے اپنے گھر کا محلِ وقوع تحریر کیا تھا اور جب میں نے اسی جانکاری کے ساتھ ٹیکسی والے کو دو چار چکر لگوائے تو وہ سٹ پٹا کر کہنے لگا۔

''آخر آپ کو جانا کہاں ہے؟''

''ڈاکٹر رحمٰن آفریدی کے ہاں، جو حال ہی میں امریکہ سے لوٹے ہیں۔'' میں نے بتایا تب ٹیکسی بیک کرتے ہوئے اس نے کہا:

''تو پہلے بتا دیا ہوتا اب تک تو پہنچ بھی چکے ہوتے۔'' پھسلتی ہوئی سیاہ سڑک پر ٹیکسی دوڑاتے ہوئے پھر وہ اطمینان سے بولا۔'' آپ نے اپائنٹمنٹ لے رکھا ہے؟ ڈاکٹر آفریدی کے ہاں تو بہت بھیڑ ہوتی ہے ہفتہ ہفتہ بھر پہلے وقت لینا پڑتا ہے چاہے اس دوران کوئی مر ہی جائے۔''

وہ خود ہی ہنس دیا جیسے مجھ سے اپنی فقرہ بازی کی داد چاہ رہا ہو، میں نے کہا:

''کیا میں تمہیں مریض لگتا ہوں؟''

اس نے میرے صحت مند جسم اور تمتماتے ہوئے چہرے کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بولا:

''نہیں تو۔''

''تو پھر مجھے ان کے گھر جانا ہے کلینک نہیں۔''

''اچھا، وہ مرعوب ہونے والے انداز میں بولا پھر خود ہی کہنے لگا'' ڈاکٹر آفریدی بہت لائق آدمی ہیں دو سال پیشتر ہی تو امریکہ سے لوٹے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تو ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا ڈاکٹر نہ ہوگا میں اپنی والدہ کو پچھلے دنوں انہیں دکھانے لے گیا تھا آدمی بھی بہت نفیس ہیں۔''

وہ نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میں اپنی سوچوں میں بھٹک گیا تھا۔ ابا نے بتایا تھا وہ اور رحمٰن چچا ایک گاؤں میں رہے تھے، بچپن اکٹھے شرارتیں کرتے گزارا۔ شروع میں تو وہ اتنا محنتی نہ تھا لیکن بعد میں وہ ڈاکٹر بن گیا پھر امریکہ چلا گیا اور اب سنا ہے وہ بہت سی ڈگریاں سمیٹ کر کئی برسوں بعد پاکستان لوٹا ہے۔

میں نے ایف۔ ایس سی کا امتحان اپنے قصبے سے پاس کیا تو سب کا یہ ارمان جاگ اٹھا کہ علی بھی رحمٰن کی طرح ڈاکٹر بنے گا۔ خوش قسمتی کہ تب ہی ابا کو کہیں سے یہ اطلاع ملی کہ رحمٰن چچا واپس آ گئے ہیں۔ انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود انہیں ایک خط لکھا جس میں میرے داخلے وغیرہ کے لئے مدد کرنے کو کہا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ جواب نہیں دیں گے ایسے لوگوں کے پاس تو خود اپنے لئے وقت نہیں ہوتا کہاں ایک بچپن کے ساتھی کا ایسا خیال کریں، لیکن سب یہی کہتے رہے کہ رحمان ایسا آدمی نہیں ہے۔ اور میں ان کی معصومیت پر ہنس دیتا۔ ہمارے بزرگ شاید پرانی قدروں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔ لیکن نعمت غیر مترقبہ کی مانند جب فوراً ہی چچا کا جوابی خط موصول ہوا تو میں گنگ ہی رہ گیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے لکھا تھا کہ علی کو فوراً یہاں بھیج دو باقی ساری ذمہ داری میری رہی۔

ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد میں اس شہر کے اسٹیشن پر اترا تو میں نہیں جانتا تھا کہ وقت کے سربستہ پردوں میں چھپا میرا مقدر کیا ہے۔ یہ اجنبی شہر میری زندگی کی نہج کو کس ترتیب سے مرتب کرے گا۔ میں سوچ رہا تھا نہ جانے رحمٰن چچا کیسے ہوں گے اور ان کی بیوی، نہ جانے وہ کیسی ہوگی، اس کا تو

میرے ساتھ ذرا بھر بھی تعلق نہیں ہے اور اس خیال سے مجھے ہول آ رہا تھا۔

میرے سامنے اجنبی شہر جگمگا رہا تھا جیسے روشنیوں کے ریلے سے بہہ رہے ہوں مختلف اشتہاروں کے نیون سائن رنگ برنگی روشنیوں میں لپٹے جھلملا رہے تھے۔ مختلف دکانوں میں جیسے چیزوں کی نمائش لگی ہو کہ قوت خرید نہ ہوتے ہوئے بھی خرید لینے پر مجبور کریں سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب یوں بہہ رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے ابھی کسی گاڑی سے ٹکر ہو جائے گی لیکن کئی سڑکوں سے بہ حفاظت گزرنے کے بعد نسبتاً ایک پرسکون جگہ جا کر ٹیکسی والے نے مجھے اترنے کو کہا۔ میں ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑا تھا جس کی آرائش و زیبائش کسی بھی نو وارد کو مبہوت کر دینے کو کافی تھی۔ جیسے اس کے معماروں کے پیش نظر یہی منتہا رہا ہو کہ ہر آنے والا پہلی نظر ڈالتے ہی ٹھٹک جائے۔ میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے سوچ رہا ہوں کہ اب کیا کروں۔ ڈرائیور نے سامان نکال کر میرے قریب رکھا اور کرایہ لے کر مونچھوں کو تاؤ دیتا واپس پلٹ گیا۔ میرے سامنے سنگ مرمر کی سل پر ڈاکٹر رحمٰن آفریدی کے نام کے سامنے اتنی ڈگریاں کندہ تھیں کہ انہیں پڑھنے کو ایک وقت درکار ہو۔ یہ سیاہ روشن لفظ ہلکے نیلے رنگ کی روشنی کے جلو میں جھلملا رہے تھے۔ وسیع و عریض عمارت پر مختلف ساخت کے بلب اور ٹیوب لائٹس بڑے عمدہ طریقے سے لگائی گئی تھیں۔ یہ گھر عجیب تاثر چھوڑتا تھا طلسمانی محل کا سا کہ خیال گزرے نہ جانے اس گھر کے اندر کیا ہوگا؟ کیا کوئی شہزادی قید ہوگی اور اس کے پائیں باغ میں کتنے شہزادوں کے بت ایستادہ ہوں گے جو آئے تو اسے قید سے چھڑوانے تھے لیکن سحر پھونک کر پتھر بنا دیے گئے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کال بیل پر انگلی رکھی اور دوسرے ہی لمحے یوں ہاتھ پرے ہٹایا جیسے غلطی کر دی ہو یہ بڑے بڑے دو کتے بھونکتے ہوئے میرے استقبال کو دوڑے آئے اور میں گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا ان کے پیچھے پیچھے ایک ملازم نمودار ہوا اور تفتیشی افسر کی طرح نام و پتہ پوچھا۔ میں نے نام بتایا تب اس نے خونخوار کتوں کو جھڑکا جو مجھے بڑے ہی خطرناک عزائم سے گھور گھور کر بھونک رہے تھے۔ پھر اس نے ایک اور ملازم کو آواز دی۔ دونوں نے مل کر میرا سامان اٹھایا میں ان کے پیچھے پیچھے سرخ بجری کی روش پر یوں قدم پھونک پھونک کر رکھنے لگا جیسے اس گھر میں چوری کی غرض سے داخل ہوا ہوں۔

یہاں رات جگمگا رہی تھی۔ اپنی پوری آب و تاب سے، روش کے دونوں جانب لگائی جانے والی باڑ میں اتنی مہارت سے لائٹس لگائی گئی تھیں کہ سرخ بجری انگارے کی مانند دمک رہی تھی۔ مختلف پھولوں کی ملی جلی خوشبو جیسے روشنی میں بھیگ کے آ رہی تھی بڑی ہی مدھر۔ میں نے دل سے تسلیم کیا کہ مالی بھی ایک فنکار ہے خوشبوؤں، نزاکتوں اور خوبصورتیوں کو سینچنے والا گمنام فنکار، جونہی میں راہداری میں داخل ہوا ایک ملازمہ نے ایک کمرے کا پردہ سرکایا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں کمرے کی آرائش اور شان و شکوہ کو ستائشی نظروں سے دیکھتا ہوا کارزصوفے پر بیٹھ گیا جبھی بھاری پردہ اٹھا اور بغیر آہٹ کے ایک لمبے قد کی لڑکی داخل ہوئی جس کے پیروں کی چاپ دبیز قالین نے جذب کر لی تھی میں اسے دیکھ کر جھٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود ایک صوفے میں دھنس گئی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی وہ کبھی کبھی میری طرف پلکیں جھپکا کر دیکھ لیتی اور پھر دیواروں سے ٹنگی نادر پینٹنگز پر نگاہیں جما دیتی۔ وہ خاموش بیٹھی اس انتہائی نفیس مہمان خانے کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی اور یہ سب کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی مصور نے اپنے شاہکار میں تخیل کی بلند سطح کو چھو لیا ہو۔ تب ایک ملازم گلاسوں میں عنابی رنگ کا مشروب لیے آیا۔ ہم نے اپنے اپنے گلاس پکڑ لیے وہ مشروب کے ننھے ننھے گھونٹ لیتے ہوئے پہلی بار رسما بولی۔

''سفر تو اچھا گزرا؟''

''جی، جی ہاں۔''

میں گھبرا گیا۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت تو نہ تھی لیکن نہ جانے اس میں کیا تھا کہ انسان پہلی ہی نظر میں مرعوب ہو جائے، اور مجھ جیسا گاؤں کا ایک انٹر پاس کر کے آنے والا لڑکا ہکلانے لگے۔ آسمانی رنگ کے ریشمی لباس پر اس نے سیاہ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس پر ستاروں کے سے سنہری مقیش کے پھول بنے تھے اس کے لمبے سیاہ بال کمر پر پڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے، فاختہ کے انڈوں کی سی رنگت والے پاؤں سرخ سینڈل میں مقید ڈیکوریشن پیس لگتے تھے اس کے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں ڈائمنڈ کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک تھا جیسے شفاف آئینے کا پرنور عکس، اس نے پوچھا کہ گھر میں تو سب ٹھیک ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ اس کے بعد نہ اس نے کوئی سوال کیا نہ میں نے کوئی جواب دیا۔ نہ جانے وہ کون تھی۔ اس لمحے بار بار یہ سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ پوچھوں چچی کہاں ہیں؟ لیکن لفظ میرے لبوں تک آتے آتے کہیں کھو جاتے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بولنے کی قوت سلب کر لیتی ہیں لفظ گونگے سے لگنے لگتے ہیں۔ پھر وہ بڑے سبک انداز میں اٹھی میں سدھائے ہوئے بندر کی طرح اس کی نقل کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ نوکر سے مخاطب ہوئی۔

''علی کو کمرہ دکھاؤ۔''

اس کے بعد نپے تلے قدم رکھتی بغیر آہٹ پیدا کیے باہر نکل گئی۔ ملازم نے انتہائی شستہ اردو میں کہا۔

''آیئے صاحب! میرے ساتھ اوپر تشریف لایئے۔''

میں اس کی معیت میں زینے چڑھنے لگا جن پر گہرے سبز رنگ کا کارپٹ بچھا تھا۔ کئی بل کھاتے ہوئے زینے چڑھنے کے بعد ہم ٹیرس پر پہنچے جس پر بچھے گہرے سبز رنگ کے کارپٹ پر نازک نازک سی کرسیاں رکھی تھیں اور جنگلے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کے گملوں میں تازہ خوبصورت پھول کھلے تھے جو ترتیب اور سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ جہاں مدھم سی ہلکی ہلکی سبز روشنی بکھر رہی تھی۔ ملازم نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا، مجھے اندر آنے کو کہا اور بولا کہ یہ آپ کا کمرہ ہے۔ کمرے کا سرخ قالین اور ہلکے ہلکے نیلے رنگ کے پردوں کا امتزاج بہت خوبصورت لگتا تھا۔ یہاں کی مالکن کے ذوق اور مکینوں کے تمول سے میں مرعوب ہو رہا تھا۔ ملازم نے کہا:

''صاحب کپڑے نکال دیجیے میں درست کر دوں۔''

''نہیں میں خود کرلوں گا۔'' میں نے کہا تو وہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔

میں کچھ دیر کھڑا کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگا۔ یہاں ایک وسیع باغ تھا جہاں کچے انگوروں اور امرودوں کی مہک اٹھ اٹھ کر ہر طرف پھیلی تھی۔ بڑے بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں ٹیوب لائٹس اس طریقے سے لگائی گئی تھیں کہ پتہ پتہ چمکنے لگا تھا لیکن اس میں شہزادوں کے بت ایستادہ نہیں تھے، مجھے ہنسی آ گئی، البتہ شہزادی تو موجود تھی، میرا خیال پھر اس لڑکی کی طرف چلا گیا، نہ جانے وہ کون تھی؟۔

میرے دل نے کہا، وہ پہلے شہزادے کہیں تم ہی تو نہیں جس کا بت یہاں ایستادہ ہوگا۔ مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے اپنے اس بے ہودہ خیال پر لاحول پڑھی۔ اور دور سڑک پر دیکھنے لگا۔ بل کھاتی سڑک پر

ٹریفک کا ازدحام تھا میں پردہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ آیا۔ میں نے غسل کیا، سفر کی تکان دور کرنے کی غرض سے ابھی دبیز بیڈ پر دھنسا ہی تھا کہ ملازم نے آ کر مودبانہ عرض کی کہ بیگم صاحبہ کھانے پر انتظار فرما رہی ہیں۔ میں زینے اتر کر نیچے آیا وہی لڑکی لمبی سی میز کے کنارے کرسی کے ذرا سے حصے پر بیٹھی تھی جیسے ابھی اٹھ کر چل دے گی۔ اب اس نے بالوں کو ایک ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا جو لگتا ابھی کھل کر بکھر جائے گا۔ اس کے سیاہ دوپٹے کا آدھا حصہ اس کے کندھے پر تھا اور آدھا نیچے جھول رہا تھا۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت نہ تھی لیکن اس کا ہر نقش دوسرے کا سہارا بنا ہوا تھا جیسے ایک زنجیر کی ہر کڑی سے کڑی جڑتی چلی جائے اور یہ مکمل حالت میں بہت خوبصورت لگے۔ جس میں کہیں کوئی کمی نہ ہو کوئی جھول نہ ہو۔

میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا تو اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''بیٹھو۔''

میں ٹک گیا تو اس نے چاولوں کی ڈش میری طرف بڑھائی میں نے کہا:

''چچا کا انتظار کر لیتے۔''

وہ مسکرا دی۔ ''کب تک انتظار کرو گے۔''

اس کی آواز بڑی واضح تھی بڑی نرم، اس کی شخصیت سے بالکل میل کھاتی ہوئی میں چپ ہو گیا۔

اس نے نوکرانی سے کہا:

''ٹیپو کو لاؤ۔''

تھوڑی دیر بعد وہ ایک آٹھ نو ماہ کے بچے کو لے آئی۔ وہ بڑا پیارا بچہ تھا گل گوتھنا سا، گورا گورا، اسے دیکھ کر مجھے اپنے چھوٹے بہن بھائی یاد آنے لگے جی چاہا اسے اٹھا لوں، وہ اسے انڈے کا حلوہ کھلانے لگی۔ میں نے اسے بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''یہ چچا رحمٰن کا بیٹا ہے؟''

اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''رحمان کا تو پتہ نہیں البتہ میرا بیٹا ضرور ہے۔''

میں بری طرح شرمندہ ہو گیا، تب مجھے یاد آیا ابا نے بتایا تھا کہ یوں تو رحمان میرا ہی ہم عمر ہے لیکن اسے ایک ہی دھن تھی، دولت اور شہرت کمانے کی، اب تک نہ جانے کون کون سی ڈگریاں حاصل

کرتا رہا ہے اب سنا ہے کوئی دو سال پیشتر ہی اس نے شادی کی ہے۔تو کیا یہ رحمٰن چچا کی بیوی ہے یعنی چچی، لیکن وہ تو کسی طور پر چچی نہ لگتی تھی۔ چچیاں تو میں نے بہت دیکھی تھیں بلکہ میں تو رہا ہی چچیوں کے درمیان تھا لیکن اس میں ان جیسی کوئی بات نہ تھی۔ میں آنکھوں میں تمام تر حسرتیں سمیٹے اسے ایک ٹک تکے جاتا تھا۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا اچنبھا تھا۔ وہ بدستور اپنے بیٹے کو کھانا کھلاتے ہوئے بولی۔

''شروع شروع میں تو میں بھی انتظار کیا کرتی تھی، اتنا انتظار کہ آنکھیں پتھرا جاتیں اور جوڑ دکھ جاتے پھر خود ہی سمجھ آ گئی۔'' آخری فقرہ کہتے کہتے وہ مسکرادی پھر سنجیدگی سے بولی۔''رحمٰن کا کوئی وقت نہیں ہے شاید وہ بارہ بجے آئیں، شاید دو بجے آئیں اور شاید نہ ہی آئیں، وہ ہسپتال کے انچارج ہیں ہر پیچیدہ آپریشن خود کرتے ہیں کسی دوسرے ڈاکٹر پر تو انہیں اعتماد ہی نہیں ہے۔اس کے بعد کلینک جاتے ہیں، پھر مختلف سیمینار اور کانفرنسیں، کبھی ملک میں کبھی ملک سے باہر، سارا سال یہ جو کانفرنسیں ہوتی ہیں تو نہ جانے کیا تیر مار لیتے ہیں بیماریاں تو کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہیں اور ایسی پیچیدہ کہ کوئی سمجھ بھی نہ پائے۔''

میں مسکرادیا اور بولا۔''چچا جائز طور پر باہر رہتے ہیں ناجائز تو نہیں۔''

اس نے سامنے لگی پینٹنگ کو بغور دیکھا جس میں ایک پہاڑی دوشیزہ بھیڑیں چرا رہی تھی اور عقب میں غروب ہوتے سورج کی شفق اس کے حسین چہرے کو گلنار بنا رہی تھی اور بولی۔''شاید ایسا ہی ہے لیکن مجھے ہمیشہ ناجائز ہی محسوس ہوا، ساری دنیا کا ان پر حق ہے کیا ہمارا نہیں۔ ہمارے لئے ان کے پاس وقت کیوں نہیں۔'' وہ بڑی دکھی ہو گئی تھی کچھ دیر یہ گھمبیر سی فضا طاری رہی پھر وہ مسکرادی۔''میں تمہیں بھی بےزار کر رہی ہوں بھلا یہ وقت کوئی ایسی بےکار باتوں کا ہے۔''

''ارے یہ تم کچھ کھا ہی نہیں رہے لو نا، تم جیسے قد کاٹھ کے نوجوان کو تو ان پر ٹوٹ پڑنا چاہیے تھا۔''

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی اگر وہ نہ ہوتی تو شاید میں ٹوٹ ہی پڑتا کیونکہ میں نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا لیکن اب جھجک رہا تھا۔اس نے روسٹ کے کئی ٹکڑے میری پلیٹ میں ڈال دیئے میں نے کہا۔

''چچی اتنا زیادہ نہیں۔''

اس کے ہاتھ وہیں رک گئے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''میرا نام نومی ہے۔'' میں شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ پھر تنبیہہ کے انداز میں بولی۔

''نومی!''

میں پلیٹ پر جھک گیا۔ اس نے بچے کو آیا کے حوالے کیا اور ہدایت کی کہ اسے دودھ پلا کر سلا دے۔ نوکر سے کہا کہ فروٹ لاؤ۔ پھر وہ سیب چھیلتے ہوئے بولی کہ یوں تو میں ہر پھل شوق سے کھا لیتی ہوں لیکن سیب مجھے بہت پسند ہے۔ پھر وہ سیبوں کی مختلف قسموں اور ذائقوں کی باتیں کرنے لگی۔ شاید اسے سیب پسند تھے اس لیے اس نے خصوصی مطالعہ اور مشاہدہ کر رکھا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ مجھے لئے دوسرے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنا پسندیدہ انگریزی میوزک آن کر دیا۔ اس نے صوفے سے ایک کشن اٹھایا اسے قالین پر رکھ کے دائیں بازو کی کہنی کو اس کے اوپر ٹکایا اور ہتھیلی پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے لمبے بال بکھر گئے تھے۔ کھڑکیوں دروازوں پر گہرے سبز پردے، چھت سے لگے خوبصورت فانوس اور گلوب، جیسے سارا ماحول طلسماتی ہو۔ وہ اتنی محو تھی جیسے میرے وجود ہی سے بے خبر ہو چکی ہو۔ پھر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''علی تم دن بھر یونہی پیر لٹکائے بیٹھے رہے ہو اور اب پھر اسی حالت میں بیٹھے ہو یہاں آ جاؤ۔''

اس نے لپک کر دوسرا کشن اٹھایا اور اپنے قریب رکھ دیا۔ یقیناً میرے پیر سن ہو چکے تھے لیکن اس کے قریب جا کر بیٹھنے سے میں جھجک رہا تھا۔ مگر اس نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے بیٹھتے ہی بنی۔ وہ پھر میوزک میں اس قدر محو ہو گئی کہ ختم ہونے تک میری طرف نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس کا اور کبھی کمرے کا جائزہ لینے لگتا۔ پھر اس نے میوزک بند کیا اور اپنی جگہ پر آ کر اسی انداز میں نیم دراز ہو کر میری طرف متوجہ ہوئی اور اس انگریزی میوزک کے بارے میں رائے طلب کی۔ میں سٹ پٹا گیا کیونکہ ایک تو میں پوری طرح سمجھ بھی نہ سکا تھا دوسرے مکمل متوجہ بھی نہ ہو سکا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ وہ ماہر نقاد کی طرح اس کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کرنے لگی۔ اس شعبے میں اس کی معلومات بڑی جامع تھیں وہ بلا تکان دیر تک بولتی رہی۔ وہ بڑی شستہ انگریزی بولتی تھی میں نے محسوس کیا کہ اسے اس زبان پر بڑی دسترس حاصل ہے۔ باتوں باتوں میں گھڑیال نے ٹن ٹن بارہ بجائے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہو بارہ بج گئے پتہ ہی نہیں چلا اور تم تھکے ہوئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں مجھے نیند نہیں محسوس ہو رہی ویسے بھی میں چچا کا انتظار کروں گا۔''

وہ اداس سی ہوگئی اور پھر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''علی! تم ڈاکٹر بننا چاہتے ہو نا!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''گویا چند برس بعد تم ایک مکمل مشین بن چکے ہو گے۔'' وہ میرے چہرے پر بدستور نظریں جمائے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ وہ ہنس دی اور دیر تک ہنستی رہی۔ میں خجل سا ہو گیا پھر اپنی جھینپ مٹانے کو بولا:

''بدلتی رتوں، پھولوں، درختوں، حسین مناظر کا مجھ پر اثر ہوتا ہے مجھے شاعری سے لگاؤ ہے، میں حسن کا شیدائی ہوں مجھے فنون لطیفہ سے محبت ہے، میری حسیات و محسوسات بڑی جاندار ہیں، میرا دل میرے دماغ پر غالب آتا ہے، میرا خیال ہے میں مشین نہیں بنوں گا۔''

وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتی رہی پھر گہری خاموشی چھا گئی یخ بستہ کمرہ اپنے گراں اور نفیس ساز و سامان کے ساتھ رات کے اس دوسرے پہر میں عجیب پر اسرار سا ہو رہا تھا شاید اس لئے کہ ان کے درمیان ان سب کو زندگی بخشنے والی ایک بڑی ہی پر اسرار اور الجھی الجھی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''بولو علی! بولتے رہو شاید پتھر ہوتا یہ گھر اور اس کے مکین پگھل جائیں۔ بولو علی۔''

مجھے لگا جیسے وہ میری ساربان بن کر کھڑی ہے اور مجھے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کو کہے گی تو ایک پل بھی سوچے بنا اس کے حکم کی تعمیل کر دوں گا۔ میں نے سوچا وہ تو اتنی اچھی ہے اتنی بے ضرر، میں بلاوجہ اس سے ڈر رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کہوں کہ اپنے دعوے کا مان رکھ سکوں، میں نے بڑا سوچ کر کہا۔

''کیٹس انسانی فطرت و احساسات کا نباض ہے ہمارے اندر کے جہانوں کو خوبصورت لفظوں میں بیان کر دینے میں خدا ہے، وہ بھی تو ڈاکٹر تھا۔''

''ہاں، ایسا کیوں ہے علی۔'' اس نے کہا۔

''شاید اس لئے کہ وہ شاعر پہلے تھا، ڈاکٹر بعد میں۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔''

بات جاری رکھنے کی خاطر میں نے پھر کہا۔ ''آپ کا شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مجھے نرم و نازک لفظوں سے پیار ہے جو آبگینوں جیسے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں میں نے ورڈز ورتھ کو بہت پڑھا جب میں سینیئر کیمرج میں تھی تو ہی اسے مکمل پڑھ لیا تھا اس کی شاعری کی بھولی بھالی معصوم سی دیہاتی لڑکی، نازک نازک احساسات و جذبات، دھیمے دھیمے شیریں لفظ، بہتی ندیاں، چہکتی خوشبوئیں، بلند کوہسار، پرندوں کے چہچہے، ابلتے چشمے، شیریں گیت، محبت کے امر سریلے نغمے مجھے یہ سب اس کی شاعری میں بہت اچھا لگتا ہے، وہ کہتا ہے سائنس نے فطرت کا حسن اجاڑ دیا ہے سائنس حسن کی قاتل ہے۔ یہ فیکٹریوں کے دھوئیں یہ بھاگ دوڑ ہمارے نازک جذبات واحساسات کو جامد کر رہے ہیں، اسے بدصورتیوں سے نفرت ہے وہ خوبصورتیوں سے پیار کرتا ہے میں نے جب بھی اسے پڑھا علی! مجھے یہ لگا کہ یہ سب میرے دل کی آواز ہے وہ میرے من کی باتیں کہہ رہا ہے۔ پھر وہ ورڈز ورتھ کے شعر پڑھنے لگی۔ اس کی آواز بڑی واضح تھی۔ مترنم، تاثر سا گھل گیا اس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا'' مجھے اختر شیرانی نے بھی بہت متاثر کیا جب میں کالج میں تھی تو خود کو اس کی شاعری کی ہیروئن ''عذرا'' تصور کرتی تھی۔'' پھر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ ''اس دور میں بھی انسان کتنا بے وقوف ہوتا ہے، ایک دم پاگل اور یہ پاگل پن کتنا خوبصورت ہوتا ہے، جس دور سے تم گزر رہے ہو کیا تم بھی بے وقوف ہو، پاگل سے۔''

''نہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم مشین نہیں بنو گے۔'' میں لاجواب سا ہو گیا۔

''علی! کیا تم کوئی ایسا کام کر سکتے ہو کہ جس کے ہر برے بھلے پہلو کو نظر انداز کر دو، کیونکہ تمہارا دل اسے کرنے کو چاہتا ہے، تم کوئی ایسا کام چھوڑ سکتے ہو جو تمہیں شہرت اور دولت سے مالا مال کر دے۔ لیکن تمہارا دل اسے کرنے کو نہ چاہتا ہو۔''

میں پھر امتحان میں پڑ گیا، بولا۔ ''جی کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

وہ مسکرا دی اور اٹھ کھڑی ہوئی

''آؤ تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں''

میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''نہیں، زحمت نہ کریں آپ، میں چلا جاؤں گا۔''

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔''علی! مجھے تکلفات اچھے نہیں لگتے۔''

میں فرمانبردار بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ زینے چڑھتے ہوئے میں نے کہا۔

''چچا ابھی تک نہیں آئے؟''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھڑیال کی ٹن ٹن سننے لگی جو رات کا ایک بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اے۔سی آن کیا، پردے درست کیے، بتیاں بند کیں اور بولی۔''سو جاؤ، شاید کل صبح تمہاری ملاقات رحمٰن سے ہو سکے۔''

انتہائی آرام دہ کمرہ اور اس سے بھی زیادہ آرام دہ بستر، میں دھنس کر لیٹ گیا، میں جاگنا چاہتا تھا تا کہ اس کے بارے میں سوچوں، رحمان چچا کے بارے میں سوچوں، اس گھر اور اپنے گھر کے بارے میں سوچوں، لیکن دن بھر کے سفر کی تکان اور ایک بالکل مختلف ماحول کا پچھلے کئی گھنٹے سے سامنا کرتے ہوئے میرا ذہن ماؤف سا ہو گیا تھا کچھ بھی سوچنے سے انکاری ہو رہا تھا، میرے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور میں نیند کے طلسم میں کھو گیا۔

یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب کسی نے انتہائی پیار سے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا انتہائی شفقت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجائے میرے سرہانے ایک دراز قد نفیس سا آدمی کھڑا تھا جس کے لباس پر کوئی شکن نہ تھی۔ کنپٹیوں پر چند سفید تار، جو اس کی زبردست شخصیت میں اور وقار پیدا کر رہے تھے آنکھوں میں ذہانت، فطانت، شفقت، سکون اطمینان اور مستقل مزاجی کی ملی جلی عجیب سی چمک، جو دل میں اترتی چلی جائے۔ وہ یقیناً رحمٰن چچا تھے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر بڑی نرم آواز میں بولے۔

''میں تمہیں کبھی بے آرام نہ کرتا لیکن رات مل نہ سکا تھا اس لیے جگا دیا میں معذرت خواہ ہوں۔''

میں خجل سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے ابا کے بارے میں پوچھا۔ اپنے اساتذہ اور گاؤں کے دوسرے لوگوں، غرض کہ ایک ایک کا حال احوال دریافت کیا۔ میں حیران رہ گیا اتنے معروف شخص کو ابھی تک اپنے بچپن کے زمانے کے لوگوں کے نام یاد تھے۔ پھر انہوں نے کہا''تم منہ ہاتھ دھو کر نیچے آ جاؤ باقی باتیں ناشتے کی میز پر ہوں گی۔''

میں جھٹ پٹ نیچے پہنچا وہ دونوں میرا انتظار کر رہے تھے۔ ننھا ٹیپو بھی اپنی ماں کے ساتھ والی

کرسی پر بیٹھا انڈہ کھا رہا تھا مجھے دیکھتے ہی چچا نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ادھر آؤ علی! یار بڑے قد کاٹھ والے نوجوان بنے ہو بالکل باپ کی تصویر لگتے ہو۔

پھر وہ گاؤں میں گزرے دنوں کو یاد کرنے لگے لیکن ان کے لہجے میں کوئی پچھتاوا، حسرت یا افسوس نہیں تھا وہ مسکرا مسکرا کر گزرے قصے سناتے رہے جو بڑے دلچسپ تھے۔ چچا کی بیوی نے ٹوکا:

''علی! تم تو کچھ لے ہی نہیں رہے۔''

میں نے کہا۔''نہیں چچی میں تو......''میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ چچا ہنس دیے۔

''بھئی علی! نومی بڑی ہی انفرادیت پسند لڑکی ہے اس کا نام نعیمہ ہے لیکن کہتے سب اسے نومی ہیں یہ مسز رحمٰن کہلانا بھی پسند نہیں کرتی میرے اور اس کے دوست سب اسے نومی ہی کہتے ہیں دراصل یہ روایتی رشتوں پر کچھ ایسا یقین نہیں رکھتی یہ عام انسانوں سے ذرا مختلف ہے شاید اسے سو برس بعد پیدا ہونا چاہیے تھا یا سو برس پہلے، لہٰذا تم بھی اسے نومی ہی کہا کرو۔''

مجھے بڑی جھینپ محسوس ہوئی۔ میں جس ماحول میں رہتا آیا تھا وہاں تو ہر شخص کسی نہ کسی رشتے سے بندھا تھا اس کا اپنا تو کوئی نام تھا ہی نہیں جہاں رشتوں کی بھیڑ میں اپنی انفرادیت ہی کھو جاتی ہے چند دن بڑی لڑکیاں بھی آپا ہوتی ہیں۔ بستی کی سب عورتیں خالہ یا چچی ہوتی ہیں اور یہاں تو رشتہ بھی تھا میں اتنا بے باک کس طرح ہو سکتا تھا؟۔

بڑے خوشگوار ماحول میں ناشتہ مکمل ہوا چچا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہو آج تو لیٹ ہو گیا ہوں علی تمہارے داخلے وغیرہ کے بارے میں رات کھانے پر بات کریں گے۔''وہ ٹیپو کو پیار کر کے چلنے لگے تو نومی نے کہا۔

''آج جلدی آجایئے گا علی کو شہر گھمائیں گے۔''

سوری نومی! آج میرے لیے بڑا مشکل ہے ایک فرانسیسی وفد آیا ہوا ہے۔''

وہ ناراض سی بولی۔''آسان کس دن ہوا تھا۔''

چچا میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔''نومی کو مجھ سے یہی شکایت ہے۔''پھر بولے۔''نومی! تم علی کو گھما لانا یوں بھی تمہیں ایک اچھا ساتھی مل گیا ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' وہ بولی۔'' کم از کم مجھے تو مہمان کا احساس کرنا ہی ہوگا۔''

چچا نے ہمیں خدا حافظ کہا اور سرعت سے باہر نکل گئے ہم اٹھ کر دیوان خانے میں آ گئے اس نے کھڑکیوں، دروازوں کے دبیز پردے ہموار کر دیئے اور اے سی آن کر کے قالین پر بیٹھ گئی۔ میں بھی ایک صوفے میں دھنس گیا اور ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ اس کی معلومات دنیا کے ہر موضوع پر اتنی جامع اور مفصل تھیں کہ لگتا اس نے اسی موضوع پر خصوصی مطالعہ کر رکھا ہے، جیسے یہی اس کا مضمون رہا ہو۔ میں ہوں ہاں کا مختصر کام سرانجام دیتا رہا۔ وہ سر کے نیچے ہتھیلی رکھے گھٹنوں ایک زاویے سے نیم دراز رہی شاید اس طرح اسے بیٹھنے کی بہت مشق تھی۔ میں خود کو اس کے سامنے مبتدی سمجھ رہا تھا بالکل نوآموز اور وہ میری ایک بہترین استاد ثابت ہو رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کتنی باتیں کیں میرا جی چاہتا انہیں محفوظ کر لوں اور بار بار سنوں، اتنی بار کہ ان کا رس میرے اندر منتقل ہو جائے۔ کتنی مکمل تھی وہ ہر لحاظ سے، میں اس کے سامنے کتنا نامکمل تھا۔

دوپہر کے پرتکلف طعام کے بعد اس نے کہا کہ اگر تم سونے کے عادی ہو تو اپنے کمرے میں چلے جاؤ، میں دوپہر کو سویا نہیں کرتی کچھ پڑھنے کی عادت ہے۔ میں نے کہا کہ میں بھی کچھ پڑھنے ہی کا عادی ہوں۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''علی! تم میرے کتنے ہم ذوق ہو ہم دونوں ایک دوسرے کے اندر کی کتاب پڑھنے کی کوشش کریں یا لائبریری چلیں۔''

میں نے گھبرا کر کہا۔'' جی جیسے آپ کی مرضی۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔''علی! در اصل ہر انسان بھی ایک کتاب ہے، بڑی ہی مشکل اور ادق، لیکن بڑی ہی دلچسپ، کبھی پڑھنے کی کوشش کرنا۔''

اس نے مجھے مشورہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے اپنے کتب خانے میں داخل ہوئی جہاں نیچے سے لے کر چھت تک چاروں اطراف شیشے کی الماریوں میں ان گنت کتابیں سجی تھیں جیسے وہ کوئی بڑی دکان ہو۔ میں حیران رہ گیا اور غیر ارادی طور پر بولا کہ اف اتنی کتابیں۔ وہ مسکرا دی۔

''ہاں میں انہی میں بستی ہوں۔ ان میں رہتے ہوئے بعض اوقات مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے میں بھی ان ہی کا ایک حصہ ہوں، ایسی کتاب، جسے ابھی تک کسی نے نہیں پڑھا، جو ابھی تک کسی پڑھنے

والے کی منتظر ہے۔ادھر ادھر لڑھکنے سے اس کی جلد تو میلی ہوگئی ہے لیکن اندر سے کاغذ ابھی تک اَن چھوئے ہیں جس کا پہلا باب بھی کسی نظر سے نہیں گزرا، شاید ابھی ایسی نظر ہی پیدا نہیں ہوئی یا شاید کتاب ہی بہت غیر دلچسپ ہے۔''

اس نے شیکسپیئر کا مختصر سا رومیو جیولٹ اٹھایا اور ورق گردانی کرتے ہوئے بولی۔

''میں اسے اتنی بار پڑھ چکی ہوں کہ بعض حصے از بر ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے استفسار کیا۔

شاید اس لیے کہ اس کی ٹریجڈی، ٹریجڈی نہیں لگتی، انہوں نے تو اپنی منزل پالی، منزل سے بھٹک جاتے تو ٹریجڈی ہوتی۔''

میں نے اس کی رائے کی تائید کی اور اپنے لئے کوئی کتاب تلاش کرنے لگا۔ پھر یونہی میں نے پوچھا چچی آپ نے یہ سب کتابیں پڑھی ہیں میں ابھی تک حیران تھا۔

''علی!'' وہ بولی۔'' مجھے رسمی باتوں سے چڑ ہے یوں بھی چار پانچ برس کا فرق ایسا زیادہ نہیں ہوتا کہ انسان دوسرے کو ایسے باعزت القاب سے نوازنے لگے۔''

میں نے سر جھکا دیا اور فیصلہ کیا کہ آئندہ میں اسے کچھ بھی نہیں کہوں گا نہ چچی نہ نومی، جب تک میں خود واقف نہ ہوسکوں کہ میرا اس سے تعلق کیا ہے۔ میں اسے کوئی نام کیونکر دے سکتا تھا۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی اور دوسری کرسی میں سما گیا۔ ہم دیر تک پڑھتے رہے شام کی چائے بھی وہیں پی۔ پھر وہ بولی کہ میں تیار ہوکر آتی ہوں تم بھی چاہو تو لباس تبدیل کرلو ذرا گھومنے چلیں گے۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے پوچھا'' ڈرائیونگ جانتے ہو۔'' میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگی'' میں تمہیں سکھا دوں گی بشرطیکہ تم اچھے شاگرد ثابت ہوئے۔ میں نے کہا۔'' میں ہمیشہ اچھا شاگرد ثابت ہوا ہوں۔''

''امتحان ہوجائے گا۔'' اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔

سڑک کے دونوں جانب سرمئی اور مٹیالے پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر چھوٹے چھوٹے پھلا ہی کے درخت اُگے تھے، کالے سیاہ پتھروں میں سے پھوٹے ہوئے ننھے منے ہرے پودے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کہیں بلند چوٹیاں سبزے سے ڈھکی تھیں۔ آسمان کو چھوتی پہاڑوں کی چوٹیوں سے بادلوں

کے بگولے سے اٹھ رہے تھے جیسے چمنیوں سے دھواں نکلتا ہے مجھے یہ منظر بہت خوبصورت لگا میں مسلسل بادلوں کے اٹھتے ہوئے مرغولے دیکھ رہا تھا اور وہ سنجیدگی سے ڈرائیونگ میں مصروف تھی ایک جگہ جا کر اس نے گاڑی روک دی اور بولی:

''نشیب میں چلیں، مجھے یہ جگہ بڑی پسند ہے۔''

کوئی دس منٹ کی ہموار زمین پر چل کر ہم ڈھلوان سے اترنے لگے۔ چونکہ دو روز پہلے وہاں بارش ہوئی تھی اس لیے بڑی پھسلن اور سیلن ہو رہی تھی کنکر پتھر پیر رکھتے ہی پھسل جاتے تھے۔ یوں بھی میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کسی پہاڑی مقام پر چلنے یا اسے دیکھنے کا، دیکھنے میں وہ جتنا خوبصورت تھا چلنے میں اتنا ہی کٹھن تھا اگر ذرا سا بھی پاؤں پھسل جاتا تو نیچے گر کر کوئی ہڈی پسلی سلامت نہ رہتی لیکن وہ باریک ایڑی والے سینڈل پہنے دوڑتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی، میں ایک قدم اٹھاتا تو لڑکھڑا جاتا اور سہارا لے لیتا، اتنی احتیاط کے باوجود جو ایک بار ذرا پاؤں پھسلا تو کئی فٹ نیچے لڑھکتا ہی چلا گیا وہ تو خدا کا شکر کہ ایک جگہ زمین ذرا ہموار تھی اور میں وہاں رک گیا وہ دوڑ کر میرے قریب آئی میرے بازوؤں، کہنیوں اور گھٹنوں پر بری طرح خراشیں آئی تھیں نئی پینٹ کا ستیاناس ہو گیا تھا میں تکلیف کے باوجود شرمندہ سا ہو کر جھٹ پٹ اٹھ کھڑا ہوا وہ مجھے یوں اٹھتا دیکھ کر ہنسنے لگی اور اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ بولی'' کالج کے بعد آج اتنا ہنسی ہوں'' اور پھر ہنسنے لگی۔ میں بھی جھینپ مٹانے کو اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا مجھے ہنستا دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہی تو ہو گئی پھر سنجیدگی سے پوچھنے لگی'' چوٹ تو زیادہ نہیں آئی۔'' میں نے آستینیں چڑھائیں جگہ جگہ رگڑ لگنے سے خون رس رہا تھا وہ افسوس کا اظہار کرنے لگی میں نے لا پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''کوئی خاص بات نہیں آگے چلیں۔''

''نہیں تمہیں چوٹ لگ گئی ہے اب واپس جائیں گے۔''

لیکن میں بضد رہا کہ آگے چلیں گے، پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑی احتیاط سے نیچے اترنے لگی جیسے میں کوئی معصوم بچہ ہوں مجھے بڑی شرم آئی کہا کہ آپ چھوڑ دیں میں اتر جاؤں گا۔ جواب میں بس وہ ہنس دی۔ ہم نشیب میں اتر کر ایک جھرنے کے قریب کھڑے ہو گئے جہاں بلندی سے پانی آ کر گر رہا تھا آواز اتنی پر شور تھی کہ ہم ایک دوسرے کی بات بالکل نہ سمجھ رہے تھے، پھوار اڑ کر ہمیں بھگو

رہی تھی۔ کچھ دیر یہاں رک کے ہم آگے بڑھے۔ سامنے ایک سیاہ پتھروں کا بلند و بالا پہاڑ تھا جس میں بے ترتیب پتھروں سے قدرت نے جیسے سیڑھیاں سی بنا دی تھیں، ہم اوپر چڑھنے لگے، اس کے کپڑے گیلے تھے اور بالوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ ایک لمبی اور دشوار گزار چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم اوپر پہنچ گئے یہاں ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ قریب ایک بکائین کا درخت تھا جس پر بے شمار رنگ برنگے جھنڈے بندھے تھے۔ اس نے بتایا کہ ان معصوم لوگوں کے اعتقاد کے مطابق یہاں کوئی پیر بستا تھا اور اس کی کرامت سے یہ چشمہ بھی پھوٹا ''دیکھو کتنوں نے مرادیں پوری ہونے پر جھنڈے باندھ رکھے ہیں آؤ ہم بھی کوئی مراد مانگیں۔''

''کیا؟'' میں ہنس دیا۔

''جو تمہارا دل چاہے۔''

میں نے کہا۔'' ہمارے دلوں میں شکوک ہیں، ہم ان معصوم لوگوں کی طرح پر اعتماد نہیں، ہمارا اعتقاد پختہ نہیں ہماری مراد پوری نہ ہوگی۔''

وہ اداسی سے بولی۔'' تم سچ کہتے ہو'' اور جوتا اتار کر پیر دھونے لگی۔ چشمے کے شفاف پانی میں ہمارا عکس ایک ساتھ پڑ رہا تھا جو بہت خوبصورت لگتا تھا۔

بادل بہت جھک آئے تھے بلند پربتوں کی چوٹیوں سے بادلوں کے بگولے دھند کی مانند اٹھ اٹھ کر آسمان پر چھا رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے ابھی پھٹ پڑیں گے یوں بھی پہاڑی علاقوں میں بارش کا اعتبار ہی کیا، اندھیرا بڑھ گیا تھا ہر سو سیاہ بادل اڑے پھرتے تھے چیڑ اور پھلاہی کے درخت سرمئی ہو گئے تھے، ہر چیز جیسے سرمئی رنگ میں رنگ گئی ہو، لیکن اس کا شاید ابھی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا کہنے لگی کہ گاڑی میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں دوڑ کے لے نہ آؤں۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ڈرتے ہو۔'' وہ ہنس دی۔

''نہیں'' میں نے جھٹ سے تردید کی۔ وہ گھاس پر کہنی ٹکا کر ہتھیلی پر سر رکھ کے اپنی عادت کے مطابق نیم دراز ہو گئی۔ گھاس کی نمی اسے بھگو رہی تھی، چوٹی پر ہوا اتنی مرطوب تھی کہ جہاں چھو جاتی نمی چھوڑ جاتی مگر وہ یوں نچنت بیٹھی تھی جیسے ہمیشہ کے لئے یہیں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ آنکھیں موندے،

دھونی دھکائے، بھبھول رمائے سادھو کی مانند۔

''علی! فرائڈ کہتا ہے ہماری وہ خواہشیں جو پوری نہیں ہوسکتیں وہ کہیں لاشعور میں اپنا بسیرا کر لیتی ہیں اور وقتاً فوقتاً شعور کی سطح پر آ کر انسانی ذہن کو ابنارمل کرتی رہتی ہیں پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان پاگل ہو جاتا ہے۔''اس نے پربتوں کے سینے سے اٹھتی دھند کو دیکھا جیسے اس میں سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ اپنی خواہشوں کو کوئی اور راستہ دے دو، وہ کہتا ہے پڑھو لکھو، دولت کماؤ، مصوری کرو، شاعری کرو، نام پیدا کرو۔''

وہ اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے بولی۔''اگر انسان ان میں سے کسی میں بھی کامیاب نہ ہو سکے تو پھر؟''

میں لاجواب سا ہو کر اسے دیکھنے لگا وہ بولی۔''تو پھر ظاہر ہے وہ پاگل ہونے کے لئے خود کو تیار کر لے۔ پاگل ہونا تو اس کے بس میں ہے نا۔''

بادل کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اب بوندیں بے قابو ہو کر نکلنے لگی تھیں اور بتدریج تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پہلی بار پہاڑوں پر برستی بارش کا منظر دیکھا تھا جیسے جلترنگ بج رہا ہو۔ نیچے گرتے آبشار کی صدا بہت تیز ہو گئی تھی۔ پہاڑی پر چڑیاں گھونسلوں میں دبک گئی تھیں۔ اور وہ پھر پوچھ رہی تھی۔''علی انسان جو چیز حاصل نہیں کر سکتا اس کی خواہش اتنی شدید کیوں ہوتی ہے؟'' وہ ماورائے حصول شے کون تھی میں آگاہ نہ تھا۔ اب بارش بہت تیز ہو گئی تھی، بوچھاڑ کا مینہ پڑ رہا تھا پتھروں پر پڑنے سے بارش کی آواز بہت پرشور ہو رہی تھی جیسے گھمسان کا رن پڑ رہا ہو۔ وہ یوں خاموشی سے بھیگ رہی تھی جیسے کچھ نہ ہو رہا ہو اور میں ڈر رہا تھا کہ اگر بارش نہ تھمی تو واپس کس طرح جائیں گے۔ پھر ایک طویل وقفے کے لئے خاموشی چھا گئی نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ پانی ہماری ہڈیوں میں دھنسا جا رہا تھا۔ بارش کی بوندیں ہمارے جسم سے اس زور سے ٹکراتیں جیسے کنکریاں بج رہی ہوں۔ بادلوں کی گھن گرج بجلی کی کڑک جیسے پوری زمین لرز رہی ہو اور یہ پہاڑ آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے مجھے ڈر لگنے لگا میں بالکل اس کے قریب ہو گیا جو بے خوف و خطر بیٹھی تھی۔ ڈرتے ڈرتے کہا''کوئی بات کریں'' مجھے احساس ہوا میں سہما ہوا بچہ ہوں اور وہ پناہ گاہ، میں کمزور ہوں وہ مضبوط، میں بے بس ہوں وہ بااختیار۔

وہ بولی''تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگ رہا؟''

''الٹے سیدھے راستے ٹوٹ پھوٹ گئے تو واپس کیسے جائیں گے۔''میں نے کہا۔

''نہ جا سکے تو کیا ہو جائے گا۔کیا تمہیں میرے ساتھ مرنا پسند نہیں؟''

میں نے سر جھکا دیا۔''ابھی تو مجھے والدین کی خواہشیں پوری کرنا ہیں۔''

وہ ہنس دی۔''مجھے تمہاری راست گوئی پسند آئی لیکن اس بات کا افسوس ہوا کہ تم بھی ایک اسکیم کا حصہ ہو۔''''دیکھو کتنا خوبصورت موسم ہے بارش کے قطرے قطار اندر قطار یوں چمکتے ہیں جیسے لگا تار ترتیب سے ستارے ٹوٹ رہے ہوں، چوٹیاں دھل رہی ہیں، عجب حسن کھل گیا ہے۔''

''کوئی چیز ہمیں مار نہ ڈالے۔''میں نے کہا۔اس نے میرے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''علی! تمہیں زندگی سے بہت محبت ہے۔''

میں نے جھینپ کر کہا۔''نہیں تو۔''

وہ بولی''نہیں، جھوٹ بول رہے ہو۔ڈرتا وہی شخص ہے جو زندگی سے بہت پیار کرتا ہے۔''

خدا کو شاید مجھ پر رحم آ گیا تھا، بارش یکا یک تھم گئی لیکن تمام جھرنے اور ندی نالے پورے زور و شور سے بہہ رہے تھے۔دھلی دھلی پتھریلی چوٹیاں چمک اٹھی تھیں، بے پناہ حسن بکھر رہا تھا ہم بڑی احتیاط سے نیچے اترے بہت پھسلن ہو رہی تھی۔گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ چچا رحمٰن آ چکے ہیں۔اس نے حیرانی سے پوچھا کہ واقعی رحمٰن آ چکے ہیں؟ باتوں کی آواز سن کر چچا خود باہر نکل آئے بولے۔

''بھئی آج تم نے بہت انتظار کروایا میں بڑے ضروری کام چھوڑ کر بھاگا چلا آیا تھا کہ صبح علی سے تسلی سے باتیں نہ ہو سکی تھیں۔''

وہ چچا کو خلاف توقع پا کر بہت خوش ہو رہی تھی بولی۔''اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا تو ہم نہ ہی جاتے کیوں علی؟''

میں نے اس کی رائے کی تائید کی۔کھانے پر بھی وہ تاسف کا اظہار کرتی رہی۔وہ بڑی دکھی ہو رہی تھی کہ رحمٰن چچا آئے بھی اور وہ موجود نہ تھی مجھے احساس ہوا وہ چچا سے گہرا لگاؤ رکھتی ہے۔پھر چچا داخلے کے بارے میں پوچھنے لگے۔میں نے اپنا رزلٹ کارڈ لا کر دکھایا اس پر نظریں جماتے ہوئے

بولے" تمہارے نمبر اچھے ہیں"۔ میں نے کہا" پھر بھی اتنے اچھے نہیں کہ میڈیکل کالج میں آسانی سے داخلہ مل جائے"۔ وہ بولے" داخل تو تمہیں کروانا ہی ہوگا اگر ایک لڑکا کالج میں داخل نہ کروا سکوں تو پھر مجھے پاکستان چھوڑ دینا چاہیے" اور ہمارا مشترکہ قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

اگلے چند دنوں میں میرا داخلہ وغیرہ سب ہوگیا مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا اور میں کالج جانے لگا۔ اکثر نوی خود مجھے چھوڑنے جاتی، عجیب لڑکی تھی وہ، چند دنوں میں اس نے مجھے اتنا بے تکلف کر دیا تھا کہ میں اس سے دل کی ہر بات کہنے لگا تھا۔ ایسی باتیں جو انسان اپنے علاوہ کسی سے نہیں کہہ سکتا جیسے میری رائے اور پسند کا ہر زاویہ اس کی پسند اور رائے کے حوالے سے ہو کر گزرتا ہو۔ وہ میرے ذہن، فکر، سوچ، پسند، ناپسند غرض کہ پورے نظریہ حیات پر چھا گئی تھی۔ کلی طور پر وہ میری بہترین استاد ثابت ہوئی تھی وہ باتیں جو میں برسوں بعد سمجھ پاتا یا شاید سمجھ ہی نہ سکتا وہ مجھے دنوں میں سمجھ آ گئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا میں ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں میری آنکھیں اب کھل رہی تھیں میں آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ آگاہی حاصل کر رہا تھا وہ میری راز داں دوست تھی مجھے عمر میں پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک اچھا دوست دل کی مانند ہوتا ہے جس سے انسان ہر وہ بات کہہ سکتا ہے جسے وہ خود بھی اچھی طرح نہ جان سکا ہو۔ کالج سے لوٹتا تو وہ میری منتظر ہوتی۔ دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد اکثر نوی کی خواب گاہ میں محفل جمتی میں دبیز قالین پر بیٹھ جاتا اور کبھی اس کے بیڈ پر دراز ہو جاتا پھر دنیا کے ہر موضوع پر باتیں ہوتیں۔ میں مسحور انداز میں سنا کرتا جیسے وہ باتیں نہ کر رہی ہو مجھ پر سحر پھونک رہی ہو۔ اگرچہ اس نے مجھے بہت منہ چڑھا رکھا تھا لیکن ایک فطری حد بندی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم میں ضرور موجود تھی۔ میں جانتا تھا وہ میرے محسن کی بیوی ہے اور میں ان کے ایک غریب واقف کار کا بیٹا، جو تعلیم حاصل کرنے کی خاطر ان کے گھر رہ رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مجھ سے ہر لحاظ سے عظیم، پروقار اور برتر ہے۔ ہم روزانہ باہر گھومنے جاتے، شہر کے مضافات میں ہمارے قدموں کے نشان بن گئے تھے۔ وہ دن بھی کتنے خوبصورت تھے جیسے دنیا کا تمام حسن اس زندگی میں سمٹ آیا ہو۔

رحمٰن چچا سے بہت کم ملاقات ہوتی میرے سونے کے بعد وہ آتے اور جاگنے سے پہلے چلے جاتے۔ جب کبھی ملتے تاکید کرتے کہ دل لگا کر پڑھا کروں اگر کوئی تکلیف ہو تو انہیں بتاؤں۔ گھر سے ابا کے بیسیوں خطوط آ چکے تھے کہ میں ہاسٹل میں کیوں نہیں منتقل ہو جاتا اور رحمٰن چچا نے ہاسٹل میں رہنے کے

ہزار ہزار نقائص لکھ لکھ کر انہیں مطمئن کیا تھا۔

اس دن میں کالج سے لوٹا تو نومی میرے کمرے میں کھڑی تھی۔اس نے مجھے پھولوں کا ایک گلدستہ دیا۔ میں نے دیکھا سامنے میز پر کچھ تحائف بھی پڑے تھے۔میں نے پھول لے لیے اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ بولی:

''تم نے بتایا تھا کہ نومبر میں تم اٹھارہ برس کے ہو جاؤ گے آج نومبر کی پہلی تاریخ ہے یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔''

میں ہک ہی تو گیا،اس نے ایک عام سی بات کو یاد رکھا تھا۔میں ششدر کھڑا اسے دیکھتا چلا گیا۔ اس نے مجھے ٹوکا کہ آج تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔میں نے مسحور سے انداز میں کہا۔

''میں یہ پھول لے لوں گا مگر یہ نہیں۔''

''کیوں۔''اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''اس لیے کہ میں اتنے قیمتی تحائف متبادل طور پر نہیں دے سکتا۔''

''علی!تم نہیں جانتے تم نے مجھے کیا دیا ہے۔اگر جان جاؤ تو نہ جانے کیا ہو جائے''وہ بولی۔

''میں تمام عمر تمہارے احسان چکاتی رہوں تو بھی ممنون ہی رہوں گی،تم نے مجھے انجانے میں کتنا مالا مال کر دیا ہے۔''

کچھ دیر ہم وقت کے سحر تلے گنگ سے کھڑے رہے پھر اس نے سحر کو توڑا۔

''اچھا اب زیادہ سیانا بننے کی ضرورت نہیں آؤ گھومنے چلتے ہیں۔''

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا''آپ مجھ پر اتنی عنایتیں نہ کیا کریں کہ میں خود کو بک چکا محسوس کرنے لگوں۔''

''کیسی عنائتیں۔''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''آپ میرے لیے کیا بن گئی ہیں۔''میں نے کہا

''کیا۔''اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے سراسیمگی میں کہا۔''میں محسوس کرتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا۔کہنا چاہتا ہوں لیکن بیان کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔''

اس نے دور نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ سچ ہے تو اپنے جذبے کو لفظوں کے لباس میں عریاں نہ کرو۔''

پھر گہری خاموشی چھا گئی جیسے کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔ اچانک اس نے گہرے سکوت کو توڑا۔

''علی! بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے میں شاعری کروں جو کچھ میرے اندر محسوس ہوتا ہے اسے لفظوں کا جامہ پہنا دوں لیکن میں یہ نہیں کر سکتی، لفظوں کی تہی دامنی پر افسوس کر کے اس خیال کو چھوڑ دیتی ہوں کہ احساس رسوا کیوں ہو۔''

میں نے کہا۔ ''بعض نقاد کہتے ہیں نا کہ اصل شاعری تو وہ ہوتی ہے جو کبھی اظہار میں نہیں آتی۔ اعلیٰ فن پارے تو فنکار کے اندر ہی تخلیق ہوتے ہیں اور اندر ہی رہ جاتے ہیں اظہار کے سانچوں کے مرہون منت نہیں ہوتے۔''

''میں تمہیں فنکار لگتی ہوں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''پتہ نہیں۔'' میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

ہم دن بھر گھومتے رہے بلند چوٹیوں پر چڑھے، ابلتے چشموں کے کنارے پتھروں پر بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیں، آبشاروں کی پرشور آوازیں سنیں پھر وہ کہنے لگی آؤ گھر چلتے ہیں میں نے کچھ خصوصی ڈشیں تیار کرنے کو کہا تھا کھانا ٹھنڈا ہو کر بدمزہ ہو جائے گا۔ گھر پہنچے ہی تھے کہ رحمٰن چچا آ گئے، وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ دن بھر کام کرنے کے باوجود ان کے چہرے پر قطعاً تھکن کے آثار نہ تھے انہیں دیکھتے ہی نومی نے کہا رحمٰن پہلے علی کو مبارکباد دو، وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''علی! بہت بہت مبارکباد لو لیکن اب یہ بھی تو بتا دو کس سلسلے میں۔''

''آج اس کی سالگرہ ہے۔'' نومی چہکی۔

''واہ بھئی ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔'' وہ بولے ''علی کا تحفہ تو ادھار رہا لیکن اب یوں کرتے ہیں کہ آج کھانا مل کر کسی اچھے سے ہوٹل میں کھاتے ہیں۔''

نومی نے اس تجویز کی بھرپور تائید کی، وہ ایک دم بچوں کی طرح کھل اٹھی تھی اس نے کہا ''اگرچہ میں نے کچھ خصوصی چیزیں پکوائی تھیں لیکن زہے نصیب کہ رحمٰن نے یہ دعوت دی ہے۔'' اس نے

نوکروں سے کہا کہ علی کی سالگرہ کی خوشی میں تم یہ دعوت اڑالینا۔ وہ اتنی خوش تھی جیسے چچا کے ساتھ جا کر اس کی کوئی دیرینہ خواہش پوری ہورہی ہو۔

ہم ریسٹورنٹ کے ہال میں داخل ہوئے تو دروازے میں کھڑی ایک چینی لڑکی نے مسکراتے ہوئے شستہ انگریزی میں خوش آمدید کہا۔ کھانے کے دوران نومی نے کہا۔

''رحمٰن! تمہیں یاد ہے ہم کتنے عرصے بعد اکٹھے باہر نکلے ہیں۔''

چچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' کچھ ایسا زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا۔''

''پورے سات مہینے اور پندرہ دن بعد۔ تمہیں یاد ہے پندرہ مارچ کو ہم ایک دعوت پر گئے تھے۔''

چچا ہنس دیے۔''تمہیں تاریخ اور دن تک یاد ہے۔''

''میرے پاس یاد رکھنے کو اور ہے ہی کیا؟'' میں نے دیکھا اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔'' رحمٰن! شاید یہ میری سدا حسرت ہی رہے گی کہ کبھی تم میرے ساتھ کچھ وقت گزارو جہاں کوئی مریض نہ ہو، ہسپتال نہ ہو، جہاں زندگی مشینی ناپ تول سے متعین نہ کی جاتی ہو۔''

وہ دکھی ہوگئی تھی۔ رحمٰن چچا نے خوش دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

''نومی! اس بار ہم سب علی کے ساتھ اس کے گاؤں جائیں گے۔''

''ضرور ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''میرا وعدہ رہا۔ اگر میں نہ بھی گیا تو تمہیں ضرور بھیجوں گا۔'' چچا نے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی'' رحمٰن! میں تمہیں کبھی کسی کام کے لئے مجبور نہ کر سکوں گی۔''

مجھے احساس ہوا وہ رحمٰن چچا سے کتنا لگاؤ رکھتی ہے مجھے ندامت محسوس ہوئی کہ میں کیوں چلا آیا تھا ان کے درمیان حائل ہونے، چچا شرمندہ سے ہو گئے تھے۔ واپسی پر بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے پھر چینی لڑکی نے خدا حافظ کہا۔ چچا کہنے لگے کہ یہ لڑکی اور ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے خیال نہیں کیا یوں بھی چینی لڑکیاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔

انہوں نے مجھے تنبیہہ کی۔

''علی! تم آنکھیں کھول کر نہیں رہتے زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہر وقت آنکھیں کھلی رکھا کرو تم شاید

ابھی جاگے نہیں ہو۔''

وہ سچ کہتے تھے میں ابھی جاگا نہ تھا ابھی تو میری آنکھیں بس کھل ہی رہی تھیں۔ میں چچا کی آنکھیں دیکھنے لگا متجسس گہری ذہین جیسے جسم کے اندر چیر کر گھسی چلی جاتی ہوں جو کچھ میرے دل میں ابھی آنے والا ہے وہ سب ان پر منکشف ہے۔

وہ رات بھی عام راتوں سی تھی۔ سوائے اس کے کہ شاید وہ چاند کی چودھویں رات تھی اور چاند فراخدلی سے تابانیاں لٹا رہا تھا۔ میں نے باوجود سردی کے پردے سرکا دیے تھے۔ شیشوں سے چھن چھن کر آتی چاند کی کرنیں سرخ قالین پر بکھر کر کئی رنگوں میں بٹ جاتی تھیں۔ سب دن رات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے کہ کبھی کوئی ایک دن ایک رات ایک لمحہ ٹھہر کر رہ جاتا ہے، صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے، عمریں سمیٹ لیتا ہے اپنی مٹھی میں زندگیاں نگل جاتا ہے۔ وہ بھی ایک عام سی رات تھی میں نے سوچا نہ تھا کہ یہ رات اتنی اہم ہو جانے والی ہے یہ معمولی سی رات اپنی جلو میں زندگیوں کے دھارے بدل دینے والا طوفان چھپائے ہوئے ہے۔

میں چاندنی میں بھیگتے پھولوں، درختوں اور پتوں کو دیکھ رہا تھا جیسے ہر طرف چاندی کے ورق بچھے ہوں اور چاندنی میں نہا کر مختلف پھولوں کی بو سارے ماحول میں بھر گئی تھی۔ اچانک میں نے سنا، نومی کہہ رہی تھی۔

''رحمٰن! دیکھو کتنی خوبصورت رات ہے، آؤ باہر چلیں، آنکھیں تو کھولو، دیکھو تو سہی، سوتے تو روز ہی ہو ایسی حسین رات تم نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ رحمان خدا کے واسطے کچھ دیر کے لئے میرے ساتھ آؤ۔''

رحمٰن چچا کی تلخ آواز سنائی دی۔''نومی! میں سولہ گھنٹے متواتر کام کرتا ہوں جوڑ جوڑ دکھ جاتا ہے، صبح سویرے پھر اٹھنا ہے، سونے نہیں دوگی تو پاگل ہو جاؤں گا۔''

''جاؤ شاباش، علی جاگ رہا ہوگا اس کے ساتھ جا کر کیرم کھیلو۔''

کچھ دیر وہ سسکتی رہی پھر مجھے محسوس ہوا وہ باہر نکل گئی ہے میں انتظار کرتا رہا وہ میرے کمرے میں نہیں آئی۔ میں اس کی سسکیاں سن کر تڑپ اٹھا تھا۔ میں نے سوچا کتنے برے ہیں رحمٰن چچا، نومی جیسی لڑکی کو دکھ دیتے ہیں۔ مجھے پہلی بار رحمٰن چچا زہر لگے، انتہائی خودغرض اور ظالم، جنہوں نے نومی کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ کیا حق تھا انہیں اس کا، مجھے ان پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا جو خود پر ایک عجیب، پراسرار اور نفیس سی

شخصیت کا لبادہ چڑھائے ہر ایک کو فریب دے رہے تھے۔ میں پاگل ہی تو ہوا تھا مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں جنگلے پر جھکی سسکتی نومی کو چپ کروانے کی کوشش میں خود بھی رو رہا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔ وہ میرے بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے اس کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے ہوں، جیسے اس سیلاب میں وہ بہہ جائے گی اور اپنے ساتھ مجھے بھی بہا لے جائے گی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سیلاب کو کس طرح روکوں۔ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

''علی! مجھے سہارا دو میں بہت تھک گئی ہوں، بہت تھک گئی ہوں۔''

میں جذباتیت کی اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ اگر وہ مجھے حکم دیتی تو میں اس سہ منزلہ عمارت سے بنا کچھ سوچے کود جاتا۔ میں نے کہا، میں پہلی بار اسے نومی کہہ رہا تھا اور تم کے الفاظ سے مخاطب کر رہا تھا۔

''نومی! تم مجھ پر اعتماد کرو، خدا کی قسم میں تمہیں سہارا دوں گا، تم جو کہو گی وہی کروں گا چچا رحمٰن بہت برے ہیں تم جیسی لڑکی کو دکھ دیتے ہیں۔''

اس کی سسکیاں یکدم رک گئیں اور چہرہ اٹھا کر ایک ٹک مجھے دیکھنے لگی اس کے شفاف عارضوں پر آنسو دھاریاں بنا کر بہہ رہے تھے لیکن اس سے اس کے چہرے کی کیفیات سے یکسر میل نہ کھاتے تھے وہ اسی سنجیدگی اور اعتماد سے بولی جو اس کا خاصہ تھا۔

''علی! اگر میں رحمٰن سے علیحدگی اختیار کر لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے۔'' اس کی آواز میں کسی لرزش کا شائبہ تک نہ تھا۔

''تم مجھے جس کام کے لئے کہو گی وہی کروں گا حکم تو کرو۔'' میری آواز جذبات کی شدت سے بوجھل تھی۔ ''مجھ پر اعتماد کر کے تو دیکھو۔''

وہ خوابناک لہجے میں بولی۔ ''میں تمہاری بات پر یقین کر لینا چاہتی ہوں آنکھیں بند کر کے فریب کھا لینا چاہتی ہوں، ایک خوبصورت فریب زندگی کی ہزاروں حقیقتوں سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے''۔

''یہ فریب نہیں ہے نومی!'' میں نے کہا۔ ''میں تو اکیلے میں بھی تمہیں کہیں اپنے نزدیک محسوس کرتا ہوں جیسے تم میری اپنی شے ہو۔'' اس سے جیسے مجھے کوئی نشے کا انجکشن دے دیا گیا ہو۔ ایمان سے کہتا ہوں یہ باتیں میں نہ کہہ رہا تھا میرے اندر سے کوئی بول رہا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا بڑا ہی منہ زور اور کمینہ تھا میں نے کہا۔ ''نومی! کتنی مظلوم ہو تمہارا اور چچا کا جوڑ ہی کیا ہے، یہ تم پر سراسر ظلم ہے تمہیں اس کے خلاف

بہت پہلے احتجاج کر دینا چاہیے تھا، میں تمہارا ساتھ دوں گا قدم قدم پر، مجھ پر اعتماد کرو نومی! اعتماد کرو۔"

پھر جیسے میں بے ہوش ہو گیا یا سو گیا یا سکرات کی کیفیت میں چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں میں ہوش میں اس وقت آیا جب شیشے میں سے چھن کر آتی زرد کرنیں سرخ قالین پر آگ سی دہکا رہی تھیں۔ تب میں جاگا اور مجھ پر منکشف ہوا کہ میں کسی بہت بڑے جرم کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ میرے خدا! میں پاگل تو کبھی نہ ہوا تھا، شاید یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا پاگل پن ضرور ہوتا ہے اور وہ مخصوص حالات میں پورا پاگل ہو جاتا ہے۔ کتنا گھٹیا تھا میں، کتنا کمینہ، اپنے ہی محسن کے خلاف منصوبے بناتا رہا تھا۔ اگر میرے والدین کو معلوم ہو جائے تو وہ مجھے کبھی منہ نہ لگائیں، تف ہے مجھ پر، میں ادھ موا سا پڑا سوچتا رہا، اب کیا کروں، کتنی نفرت محسوس ہو رہی تھی مجھے اپنے وجود سے۔ میں اٹھا الٹے سیدھے کپڑے بدلے، کتابیں اٹھائیں اور پچھلی سیڑھیاں اتر کر باہر آ گیا۔ کالج گیا تو دن بھر نہ جانے کیا پڑھا گیا اور کیا پڑھایا گیا میں کچھ نہیں جانتا، میرا وجود وہاں تھا لیکن میں موجود نہ تھا۔ اور جب انسان موجود ہو کر نا موجود رہے تو کیا اس دن کو بھی زندگی میں شمار کیا جانا چاہیے؟ میں نے پرنسپل صاحب سے بات کی کہ مجھے ہوسٹل میں جگہ دی جائے لیکن اُنہوں نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ ہوسٹل میں جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہا "سر! میں یہیں رہوں گا چاہے مجھے برآمدے کے فرش پر ہی سونا پڑے۔"

میری آواز یکدم بلند اور تلخ ہو گئی تھی وہ ہنس دیئے اور کہنے لگے۔

"ڈاکٹر آفریدی نے بتایا تھا کہ تم ان کے بھتیجے ہو اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم رہتے بھی انہی کے پاس ہو، کیا وہ تمہیں اس کی اجازت دے دیں گے؟"

رحمٰن چچا کا نام سن کر میری پیشانی پر ندامت کے قطرے ابھر آئے میں نے کہا:

"وہ تو سب ٹھیک ہے سر! لیکن آپ جانتے ہیں امتحان قریب آ رہے ہیں اور گھر پر توجہ سے پڑھا نہیں جاتا ہے۔"

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اطلاع ملی کہ ایک خاتون مجھے باہر بلاتی ہیں۔ یقیناً وہ نومی تھی میں ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔ میرا دوست پوچھنے لگا کہ یار تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو بات کیا ہے، لیکن میں اسے کوئی جواب دیئے بغیر خوف زدہ سا باہر نکل آیا جیسے میں ایک لفظ بھی بولا تو میرے دل کا راز شہر کی تمام عمارتوں پر جلی حروف میں لکھ دیا جائے گا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے

گاڑی اسٹارٹ کر دی میں سر جھکائے کھڑا رہا وہ بولی۔

''بیٹھو گھر چلیں''

میں پھر بھی مجرموں کی طرح سر جھکائے زمین کو گھورتا رہا۔ اس نے کہا۔

''میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں۔''

میں منمنایا۔''میں بہت شرمندہ ہوں، آپ سے نظر نہیں ملا سکتا، آپ مجھے جو بھی سزا دینا چاہیں دے دیں میں سزاوار ہوں۔''

میں نے محسوس کیا وہ مسکرا دی ہے جیسے کوئی انتہائی معصوم بچہ کوئی حماقت کر رہا ہو۔

''تمہاری سزا یہی ہے کہ اچھے بچوں کی طرح گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور گھر چلو۔''

''میں گھر نہیں جاؤں گا۔''میں نے کہا۔

''کیوں۔''اس نے حیرانی سے مجھے گھورا۔

''میں ہوسٹل میں رہوں گا آپ میرا سامان بھجوا دیجئے گا۔''وہ چپ رہی، میں پھر بولا۔''میں اتنا شرمندہ ہوں کہ خود سے بھی نفرت محسوس ہو رہی ہے۔''

''آخر کس بات پر؟''

وہ بولی۔ میں نے حیرانی سے پہلی بار اسے براہ راست دیکھا وہ مطمئن اور پرسکون بیٹھی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو، شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا، کوئی بھیانک اور ڈراؤنا خواب، میری اس حالت پر وہ ہنس دی۔

''علی! تم کچھ دنوں کو خوبصورت یاد بھی نہیں بننے دو گے رات تو بڑے دعوے کر رہے تھے۔''

اف! جی چاہا اس کا منہ نوچ لوں، میں واپس بھاگا اور آ کر کمرے میں دم لیا جیسے میرے پیچھے شیطان لگا ہو۔ مجھے معلوم تھا اگر میں کچھ دیر اور کھڑا رہا تو مغلوب ہو جاؤں گا وہ مجھے زیر کر لے گی۔ کٹھ پتلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگوں گا مجھ پر سحر پھونک کر پرندہ بنا کے مٹھی میں بند کر لے گی۔ مجھ میں اتنی استقامت کہاں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں۔

شام کو چچا رحمٰن آ گئے۔ وہی دل موہ لینے والی مشفق مسکراہٹ، آنکھوں کی ذہین اور من کا راز جان لینے والی چمک، نفیس اور بے شکن لباس پرسکون چہرہ، لہجے میں محبت کی مٹھاس، انہیں دیکھ کر میں

زمین میں گڑ گیا، ان کی نگاہیں تو دل چیرتی تھیں اور میں تو بالکل اناڑی تھا بولے۔

''علی! مجھے معلوم ہوا ہے تم ہاسٹل میں آ گئے ہو، وجہ؟''

ان کے لہجے میں محبت اور شفقت کا سمندر سا تھا جی چاہا ان کے قدموں سے لپٹ جاؤں۔ میں نے کہا۔

''امتحان قریب آ گیا ہے گھر میں پڑھنا مشکل ہے اگر آپ اجازت دے دیں تو بہتر ورنہ جو آپ کا حکم؟''

''اور میرا حکم یہ ہے کہ تم گھر چلو گے'' اور وہ مجھے گیٹ پر ڈراپ کر کے خود کلینک چلے گئے مصنوعی آبشاروں، پہاڑیوں اور فواروں والے وسیع و عریض لان میں مجھے کھڑا دیکھ کر ملازم بھاگے آئے۔'' بیگم صاحبہ تو لائبریری میں ہیں''، مجھے اطلاع دی گئی۔

میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ ملوں یا واپس لوٹ جاؤں، واپس جانے کا راستہ ہموار تھا اور یہی بہتر تھا اور میرا فیصلہ بھی یہی تھا۔ لیکن مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کتاب میں محو رہی کچھ دیر یونہی گزر گئی پھر کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بولی۔

''علی! یہ کچھ نئی کتابیں آئی ہیں چاہو تو پڑھ لو۔''

اس لمحہ وہ اتنی اچھی لگی جتنی پہلے روز لگی تھی ایک دم معصوم اور مظلوم، جی چاہا وہ گھنٹوں بولتی رہے اور میں مبہوت بیٹھا سنتا رہوں۔ پھر وہ باتیں کرنے لگی اور میں بیٹھا سنتا رہا، وقت اڑنے لگا اندازہ ہی نہیں ہوا، دل نے پھر اکسایا یہیں پڑاؤ ڈال دو، کتنا کمینہ تھا میں، مجھے لگا ہم دونوں ایک ہی زبان میں لکھی ہوئی دو کتابیں ہیں جو ایک دوسرے کے ادھورے موضوع کو مکمل کرتی ہیں لیکن بدقسمتی سے دو مختلف الماریوں میں بند کر دی گئی ہیں۔ اس نے کہا'' کھانے کا وقت ہو گیا ہے آؤ'' اتنی جلدی؟ میں نے سوچا، ابھی تو میں لمحہ بھر پہلے ہی تو آیا تھا، یا شاید اس کی معیت میں وقت اپنی کیت کھو دیتا ہے۔

نومی بڑی عجیب عورت تھی میں اسے کبھی سمجھ نہ پایا شاید وہ ڈی ایچ لارنس کی کہانیوں کا کوئی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کردار تھی یا ہماری پرانی کہانیوں کی کوئی پری تھی جو اڑتے اڑتے کسی گلفام شہزادے کو سر بام سوتے ہوئے دیکھتی ہے تو یکدم اسے اٹھا کر اپنے شیشے کے محل میں مقید کر دیتی ہے۔ اس کی ناز برداریاں اٹھاتی ہے۔ سو سو چونچلے کرتی ہے لیکن جب ذرا بھی ناراض ہو جاتی ہے تو اندھے کنویں

میں پھینکوا دیتی ہے شاید میں بھی کوئی معصوم شہزادہ ہی تھا۔لیکن نہیں اب اس مرحلے پر میں خود کو بے گناہ ثابت نہیں کروں گا۔شاید ہم دونوں ہی نفسیاتی مریض تھے۔

ہم نے ایک دوسرے سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے زیادہ حاصل نہ کر سکتے تھے اور جو کچھ حاصل کر چکے تھے اسے کوئی چھین نہ سکتا تھا اور جو کچھ ہم نے ایک دوسرے سے چھینا تھا اس کی کوئی تلافی نہ ہو سکتی تھی۔شاید ہم دونوں یکساں قسم کے دو پھول تھے لیکن دونوں ایک ہی زمین پر اور ایک ہی موسم میں پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

کبھی میں اتراتا تو بتاتا کہ کالج میں لڑکیاں مجھے پرنس کہتی ہیں۔وہ بڑے اشتیاق اور دلچسپی سے پوچھتی''اور کیا کہتی ہیں؟''میں مزے لے لے کر کالج کے قصے سنایا کرتا میری تعریف سن کر اس کی آنکھوں میں یوں چمک آیا کرتی جیسے یہ تعریف اس کی ہو۔جیسے میں اس کی تخلیق ہوں اور وہ اپنے شہ پارے کی تعریف سن کر پھولے نہ سما رہی ہو۔وہ کہا کرتی ''داستان کا ہیرو ہمیشہ خوبصورت ہی ہوا کرتا ہے۔''تب میں پوچھتا کہ تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟وہ افسردگی سے جواب دیتی پتہ نہیں شاید ابھی ڈور یا کٹی پتنگ۔''

اس شہر کے مضافات میں ہمارے قدموں کے نشان نشیب و فراز میں راستے بنا گئے تھے۔چشموں کے شفاف پانیوں میں جھلملانے والا اپنا عکس ایک ساتھ ہم خاموشی سے پہروں دیکھتے،جنگلی پھولوں سے خوشبوؤں کے گھونٹ بھرتے،غروب ہوتے سورج میں گرتے آبشار کا سازینہ سنتے رہتے۔پانی کی دھاری پہلے سنہری ہوتی تھی پھر شام گہری ہو جاتی۔پانی کی آواز مزید اونچی اور وسیع تر ہو جاتی،اتنی اونچی کہ اس کے سامنے دوسری آوازوں کا کوئی وجود نہ رہے۔پتھر کے چھوٹے چھوٹے ریزوں اور پانی کے چھینٹوں سے کھیل کھیل کر ہم شام کو اور گہرا کر لیتے تھے۔چشمے کے سینے سے چمٹے بکائین کے درخت کے قریب کھڑے ہو کر وہ روز ہی کوئی دعا مانگتی تھی اور مجھے بھی اس میں شامل کیا کرتی تھی،نہ جانے کیا؟میں نے اس سے کبھی نہ پوچھا تھا۔

ان دنوں میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے دوسرے سال میں تھا جب نومی کے ہاں دوسرے بچے نے جنم لیا۔میں بھی اسے دیکھنے گیا۔وہ چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا آنکھیں بند کیے مٹھیاں بھینچے پڑا تھا مجھے وہ بہت اچھا لگا چچا بھی وہاں موجود تھے کہنے لگے۔

''دیکھو علی! یہ بالکل تم پر گیا ہے۔''

اور میں اتنا گھبرا گیا کہ اگر چچا میری طرف دیکھ رہے ہوتے تو یقیناً چونک اٹھتے۔ میرے پورے وجود میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی میرے دل کی دھڑکن رک سی گئی۔ وہ بالکل میری تصویر تھا اگر میرے بچپن کی تصویر اس کے مقابل رکھ دی جائے تو کوئی تضاد ظاہر نہ کر سکے۔ میں واپس پلٹا اور بغیر پیچھے دیکھے نکل جانا چاہا جیسے مڑ کر دیکھا تو پتھر کا ہو جاؤں گا۔ میرا ایک قدم ابھی فضا میں معلق تھا اور دوسرا چوکھٹ کے باہر کہ مجھے پیچھے سے نومی کی آواز سنائی دی۔ ''علی تم چاہو تو ہوسٹل میں منتقل ہو سکتے ہو'' میرے اندر کوئی چیز چھنا کے سے ریزہ ریزہ ہو گئی گویا مجھے آزادی کا مژدۂ جانفزا سنا دیا گیا تھا لیکن کیا میں آزاد تھا؟

مرقد شب

اس نے اپنی سوکھی سڑی لبوتری انگلیوں پر پل پل لحظ لحظ چنا اور بڑبڑایا۔ ''پندرہ سال'' اس کی نس نس میں برف سی چبھنے لگی اور نرگٹ میں اٹکی جان پھڑ پھڑانے لگی۔ پسینہ سوجن زدہ پسلیوں پر کینچوؤں کی طرح رینگنے لگا۔''

''نہیں نہیں'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں زندہ رہوں گا۔'' آواز اس کے دھنکے ہوئے پھیپھڑوں سے نچڑ کر نرگٹ کی سکڑی نالیوں سے ریزہ ریزہ ہوکر بہنے لگی اور سانس کی دھونکنی میں دم الجھنے لگا۔ تب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو چارپائی سے ذرا سا اوپر ہوکر رہ گیا اسے خیال آیا کہ اس کی بیماری میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ پہلی کوشش میں کھڑا نہیں ہو سکا۔ اس خیال نے اس کے اندر پھیلی شدید ترسنسنی کو ایک نقطے پر مجتمع کر کے ہانپتا ہوا چھوڑ دیا اور اسے یکدم کھانسی آ گئی۔ اس کے جسم کا رہا سہا لہو اکٹھا ہوکر حلق میں بھر گیا اور پھر باچھوں کے کناروں سے بہہ نکلا۔ گہرے اودے رنگ کا خون درختوں کے خشک پتوں، کیکر کی سوکھی پھلیوں اور دھول کے بچھے فرش پر ہلکے ہلکے پھیلنے لگا۔ جس پر اڑتی ہوئی مٹی کی تہ جم رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ اور اس نے سوچا جب سے وہ بیمار پڑا ہے اس نے اتنا خون کبھی نہیں تھوکا۔ گویا...... زلزلوں کی زد میں آیا اس کا وجود چٹخنے لگا۔ اور وہ پھر بڑبڑایا۔ جیسے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت خود کو دے رہا ہو۔ ''میں زندہ رہوں گا۔ میں زندہ رہوں گا۔''

ہڈیاں پگھلا دینے والی دھوپ میں لپٹے گرد کے بگولے دائروں میں چکرا رہے تھے۔ یوں جیسے ایک نقطے کے گرد دیوانہ وار دھمال ڈال رہے ہوں۔ دھول فضا میں بلند ہوتی تو ایک دھوئیں کا غبار سا زمین کے ساتھ ساتھ پرواز کرتا ہوا محسوس ہوتا۔

سامنے کھیتوں کو جاتی لمبی سڑک ویران پڑی تھی جس پر دھول کے غبار اڑ رہے تھے۔ دو رویہ کھڑے کیکر کے لنجے لنجے درخت انگلی انگلی اتنے لمبے سفید کانٹوں میں ڈھکے جھکڑوں کی زد میں تھے۔ جن کے پتے کملا گئے تھے۔ اور سوکھی مڑی تڑی پھلیاں سروں پر یوں جھل رہی تھیں جیسے مردہ چھپکلیاں۔ تبھی دھول کے اڑتے بادلوں میں سے اس کا چھوٹا بھائی نمودار ہوا۔ دائیں کندھے پر ہل رکھے جس کی لمبی پھال پیچھے لٹک رہی تھی۔ پنجالی کے بوجھ تلے گردنیں جھکائے بیلوں کی جوڑی کو ہانکتا چلا آتا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی دونوں نوجوان بہنیں سروں پر چارے کی بڑی بڑی گٹھڑیاں اٹھائے بھاگنے اور چلنے کی درمیانی رفتار سے آ رہی تھیں۔ بوجھ تلے چلتے ہوئے ان کے گھٹنوں میں ہلکا خم پڑ جاتا تھا۔ الٹی ٹھنسی درانتیوں کی سیاہ دستیاں، برسیم کے چارے کے جامنی پھول لڑکیوں کے صحت مند سانولے چہرے اور ملگجی اوڑھنیاں سب کچھ دھول میں دھندلا رہا تھا۔ بشیر بیلوں کی نکیلیں کھونٹوں سے اڑستے ہوئے بولا۔ ''نجو! کیا حال ہے'' تب اس نے تاریک غاروں کے دہانوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ ابھری ابھری دو روشن و تابناک آنکھیں جن میں زندگی کی مشعلیں فروزاں تھیں۔ مضبوط ہڈیاں، صحت مند گوشت اور دوڑتے ہوئے تروتازہ خون سے لبریز شریانیں، تپے ہوئے تانبے کی سی رنگت والی کسی ہوئی جلد جیسے اس کے اندر ہموار پتھر بھر دیئے گئے ہوں۔

نجو نے خشک کنوؤں کے کواڑوں کو بھیچ لیا اس کے اندر کوئی بارودی سرنگ پھٹ گئی۔ کاش اس لمحے اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں ہوتیں تو وہ انہیں مروڑنے لگتا۔ اس کا باپ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''بشیر! کل اسے پھر میاں جی کے پاس لے جاؤ۔'' اس کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری'' شاید خدا انہیں کے ہاتھ سے کاٹ دے۔''

''اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔''

''اچھا بابا''

بشیر نے بیلوں کی گردنوں سے پنجالی کا بوجھ اتارتے ہوئے نرمی سے جواب دیا اس کی ماں چولھے کے پاس سے کوڑا اسمیٹ رہی تھی۔

بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پندرہ برس بیت گئے کوئی درگاہ، کوئی خانقاہ، کوئی پیر فقیر نہ چھوڑا۔ اس کملی والے نے مجھ دکھیاری کی کہیں نہ سنی۔'' ربا تو میری کب کاٹے گا'' وہ اپنا میلا کچیلا پلو منہ پر ڈال کر بین کرنے لگی۔ اس کی دونوں نو جوان بہنیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف سسکنے لگیں۔ بشیرا اپنا کام ادھورا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ماں کے قریب آ گیا۔

''اماں! تجھے اس ذات سے امید نہیں ہے کیا۔''

اس نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کی۔'' وہ میرے بھائی کو ضرور شفا دے گا۔'' اس کا لہجہ اس کے جسم کی طرح مضبوط تھا۔ نجو نے اندھیرے کنوؤں کے پٹ ذرا وا کیے۔ بشیر کے بازوؤں میں تڑپتی مچھلیاں، مضبوط جسم اور تپے تانبے کے سے سینے پہ ننھے منے تھرتھراتے پسینے کے قطرے وہ صحت مندی اور تندرستی کی نمائش گاہ بنا کھڑا تھا۔ نجو نے آنکھیں میچ لیں۔

اماں کے بین اس کے کانوں سے مسلسل ٹکرا رہے تھے۔ جن کی آواز تو اگرچہ دھیمی پڑ گئی تھی۔ لیکن لفظ زیادہ واضح سنائی دینے لگے تھے اماں بین کرتے کرتے پھر کام میں مصروف ہو چکی تھیں۔ بشیر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور دیوار کے ڈھلے سائے کی طرف لے چلا۔ نجو نے کنکھیوں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی گویا اس کی نحیف و نزار ہڈیوں میں گڑ گئی ہو۔ کہیں اندر دھنس گئی ہو۔ نجو کا جی چاہا وہ اس کی گرفت جھٹک دے۔ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مونچھیں مروڑنے لگے لیکن اتنا کہہ سکا۔

''بشیر یا میں مروں گا نہیں۔''

بشیر نے اسے چارپائی پر بیٹھا دیا اور پیچھے تکیے رکھتے ہوئے دھیرج سے بولا'' ان شاء اللہ'' نجو کو اس کے جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو'' شاید''۔ اور شاید جیسا منافق اور دوغلا کوئی دوسرا لفظ کیا ہوگا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھپری میں اماں چولھا جلا رہی تھی۔ گیلی لکڑیوں کا کڑوا کسیلا دھواں حلق میں جا کر زہریلا ہو جاتا تھا۔ چھپری کی چھت سے راکھ کے جالے پیچیدہ نقشوں

کی طرح لٹک رہے تھے۔تبھی کلف لگے کپڑے کی مانند اکڑی مونچھوں اور سجے سجائے نیچے والے حقے سمیت ماما رحموں گھر میں داخل ہوا اور حسب معمول بولا۔''نجو کیا حال ہے۔'' لیکن نجو کو خلاف معمول اس کے لہجے سے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو ابھی زندہ ہو۔اس لمحے اس کا جی چاہا کہ سامنے چولھے میں بھری بھوبھل میں منہ دھنسا دے۔لیکن پھر سنبھل کر بولا۔''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' پر شاید اس کے دھنکے ہوئے پھیپھڑوں میں اتنی واضح اور بلند آواز میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ یکدم کھانسی کا دورہ پڑا اور کھانستے کھانستے وہ چارپائی سے لٹک گیا۔اماں چولھے سے بےتابانہ اٹھی اور اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ پل کے پل میں دور اور نزدیک کے لوگ جمع ہو گئے جیسے خطرے کا سائرن بج گیا ہو۔ سب اپنے اپنے مشورے اور علاج بتا رہے تھے اور ان کے شور میں نجو کی کھانسی یوں دب گئی تھی جیسے پانی میں بلبلے پھٹ رہے ہوں،وہ چلو بھر بھر خون تھوک رہا تھا۔اس کی ماں اپنے ملگجے دوپٹے سے بار بار اس کا منہ صاف کرتی اور روتی جاتی۔اماں کے چہرے پر پھیلے جھریوں کے جال میں میلے میلے آنسو جنس کر جذب ہو رہے تھے۔ مامے رحموں نے کہا۔

''میں پھر کہتا ہوں۔اسے شہر لے جاؤ۔''

چاچے اکرم نے فوراً تردید کی۔

''کیا کہتے ہو۔میاں جی کی دوا جاری ہے ان سے سیانا کون ہوگا۔''

چاچی ہاجراں نے ٹوکا۔''چھوکرے کو بیماری ویماری کچھ نہیں۔سایہ ہے سایہ جتنے سیانے آئے سب نے یہی بتایا۔بہن وہ نالیاں والے شاہ جی کے تعویز ڈالے یا نہیں۔''

اماں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا۔ جو تعویزوں کے بوجھ تلے کٹی شاخ کی طرح جھول رہی تھی پھر دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں جس میں اس کا خون اور اماں کے آنسو ایک ساتھ جذب ہو رہے تھے اور گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا۔

''حرام خور! اللہ اس کی ہڈیاں دوزخ میں جلائے۔جس نے تمام عمر مجھے خون رلایا۔چاند کی پندرہویں رات،چاند آدھا بادلوں میں اور آدھا باہر۔اور وہ میری چارپائی کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ اچانک جو میری آنکھ کھلی تو چڑیل تیری نکل گئی۔

یہ چار پانچ برس کا میرے پہلو سے لگا سو رہا تھا۔میری جو نظر اس پر پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ

ہاتھ پیر مڑے ہیں اور جا بجا خون کے چھینٹے پڑے ہیں میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تعویز ڈال گئی ڈائن! کہ میرا بچہ لہو تھوک تھوک کر مرے۔اماں نے سیکڑوں بار دہرائی داستان کو یوں دہرایا جیسے پہلی بار بیان کر رہی ہو۔اور حاضرین نے کہانی سننے والے بچوں کی سی دلچسپی سے یوں سنا جیسے پہلی بار سن رہے ہوں پھر آخری فقرہ بولتے بولتے اماں کی آواز بین میں ڈھل گئی اور وہ خون سے لتھڑا پلو منہ پر ڈال کر بین کر کر کے رونے لگی۔اس کی بہنیں چیخ چیخ کر اماں کا ساتھ دے رہی تھیں دوسری عورتیں مروتاً آواز ملانے لگیں، گویا اس کا ماتم اس کے سامنے ہو رہا تھا۔نجو نے ابروؤں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان سے جھانکا۔عزاداروں کے بیچ بے تاثر چہرہ لیے ہاجو کھڑی تھی۔ہاجو جو صحت مندی اور تندرستی کی علامت ہے۔ہاجو جس کے عنابی ہونٹوں پر زندگی گنگناتی ہے۔جو ہنستی ہے تو کھنک سی دل میں اترتی چلی جاتی ہے جو بولتی ہے تو نغمگی حیات آفریں ترنم میں ڈھل جاتی ہے۔

اتنی زندگی، اتنی تازگی، اتنی رعنائی۔ہاں یہی ہاجو اس کی منگیتر ہے نہ جانے کب سے اس دنیا میں وجود لاتے ہی اس کے نام کر دی گئی تھی قدرت کا کتنا دلچسپ مذاق تھا۔ساڑھے پانچ فٹ کی اس بھرپور لڑکی کی طرف دیکھنے کا وہ حوصلہ بھی نہ کر پاتا تھا۔لیکن اسے اپنی ملکیت تصور کرتا تھا۔چاہے وہ موت سے نبرد آزما ہو۔چاہے اس کی ہڈیاں گوشت اور خون کی قلت کے باعث خوفناک ہو چکی ہوں۔ ہاجو تو اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔کیونکہ وہ اس کی بچپن کی منگ تھی۔

وہ اسے پندرہ برس تک پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا تھا۔کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اس میں حلول کر گئی ہے۔وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کس وقت بولتی ہے۔کب چپ ہو جاتی ہے اور کب رو دیتی ہے لیکن نہیں وہ تو کبھی روئی نہ تھی۔ہاں البتہ دوسروں کو بار بار رلایا تھا۔

پھر اس رات اس کے پھیپھڑوں کے تمام چھید ایک ہو کر ایک بہت بڑا گھاؤ بن گئے۔یوں کہ اگر کوئی اسے یہ کہہ دیتا کہ وہ ایک معین وقت پر مر جائے گا تو بھی اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

اس رات ہاجو کی ماں آئی تھی اور اماں کو اگلی کوٹھڑی میں لے جا کر کہا تھا۔

''دیکھو بہن! میں جوان بیٹی کی ماں ہوں کب تک اس بوجھ کو سینے سے لگائے پھروں گی۔ ہاجراں نذیر کی منگ ضرور تھی۔لیکن وہ بات تو اللہ کو منظور نہ تھی۔تم نے بشیر کا نام لیا۔میں نے ہاں کہہ دی لیکن اب میں کب تک انتظار میں بیٹھی رہوں گی''

اماں نے کہا تھا ''اور تو کوئی بات نہیں بہن...... بس ذرا نجو کا خیال آتا ہے اسے دکھ ہوگا۔'' اماں کے لہجے میں بڑی لجاجت تھی۔

ہاجو کی ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''سن بہن! ساؤنی تک دیکھوں گی اس کے بعد بالکل نہیں۔ میرا اپنا سگا بھائی مجھے رشتے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔'' اس کی ماں نے بھرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔''

اور پھر اماں دیر تک بین کر کے روتی رہی اس کی آواز اگلی کوٹھڑی کی کچی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر عجیب بھیانک ہو رہی تھی۔ اور نجو کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی بس ساؤنی تک ہے۔ اس کے بعد وہ انتہائی شرمناک اور ذلیل طریقے سے مار دیا جائے گا اور اس کی زندگی ختم کرنے والا بشیر ہے۔ خود اس کا سگا بھائی۔............

کیونکہ اس کا جسم انتہائی مضبوط ہے اور اس کے چہرے پر صحت مندی اور زندگی رقصاں ہے۔ نجو کے دماغ کی نسیں ٹوٹنے لگیں۔ اسے لگا اس کے اندر پٹرول بھرے کنستروں میں آگ لگ گئی ہے اور کڑوا کسیلا دھواں اس کی کھوکھلی ہڈیوں، خشک شریانوں اور پور پور میں شوکاریں مارتا پھر رہا ہے تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ زندہ رہے گا۔ اس وقت تک کہ ہاجو اس کی دلھن بن کر اس کے گھر نہیں آجاتی یا جب تک اس کی خوبصورت آنکھوں کے جگنو جگمگا جگمگا کر بے جان نہیں ہو جاتے۔ اس سے اگلے روز ہی ہاجو آئی تھی۔ اور اس کی چارپائی کے قریب کھڑی ہو گئی اور پکار کر پوچھا۔ ''ماسی کیا حال ہے۔'' اماں نے پوچھا۔

''ہاجو تیری سہیلی رحماں کا کیا حال ہے، غریب کتنی سوہنی تھی جن چمٹ گیا اور ایسا کہ جا بھی نہیں رہا۔ کیا کچھ نہ پیروں فقیروں نے کیا انگلیوں پر جلتے کوئلے رکھ دیے مار مار کر شہتوت کی چھڑیاں توڑ ڈالیں گرم سلاخوں سے ہاتھ پیر داغ دیے پر وہ یہی پکارتا رہا نہیں جاؤں گا کبھی نہیں جاؤں گا۔ آہ بے چاری! کرماں والے نہ جانے کہاں سے چمٹ گئے'' ہاجو اتنے زور سے ہنسی کہ اس کے دھکتے ہوئے پھیپھڑے پھڑ پھڑانے لگے ہنستے ہنستے ایک پاؤں اس کی چارپائی پر رکھ دیا۔ نجو کو لگا وہ اس کے زخمی دل پر پیر رکھے قہقہے لگا رہی ہے۔ وہ بسمل پرندے کی مانند تڑپنے لگا۔

''اے لڑکی! لڑکیوں کو ایسے بے باکانہ قہقہے نہ لگانا چاہئیں۔''

اماں نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔تو وہ اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔''ماسی! میں کب ہنسی ہوں یہ تو میرے اندر ہے کوئی جو ہنستا چلا جاتا ہے۔''

اماں فکر مندی سے بولی۔''ری تو اس کے پاس نہ بیٹھا کر گھنٹوں نہ جانے کیا راز و نیاز کرتی رہتی ہیں۔کل کو کر ماں والے تجھ پر نظر کر بیٹھے تو؟''

وہ اپنی رکتی ہنسی میں پھر بے قابو ہو گئی۔اچانک اس کی نظر نجو پر پڑی۔

''نجو! غریب کو بھی تو جن چمٹ گئے ہیں۔شاید جنوں کا بادشاہ ہو۔'' پھر اسے ہنسی آ گئی یہ جن ان بے رس ہڈیوں، بے خون شریانوں اور جھلسی ہوئی جلد میں کیا کر رہا ہے۔کوئی بڑا ہی بد ذوق جن ہے۔

تبھی بشیر گھر میں داخل ہوا۔اس نے کرتا اتار کر دائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا۔اس کے اوپر کسی دھری تھی جس کے سیاہ دستے پر اس کا مضبوط ہاتھ جما تھا۔ہاجو کو دیکھ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے حکم ملتے ہی مارچ شروع کر دے گا۔نجو نے تاریک کنوؤں کے دھانوں سے جھانکا۔ہاجو اور بشیر کی نگاہیں لحہ بھر کو ملی تھیں۔اور عرقِ لالہ سے لبالب بھرے پیانے ذرا سے چھلک گئے تھے۔

''ہاجو وہ تیری سہیلی کے جن کب تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ہونٹوں کی عنابی مچھلیاں تڑپنے لگیں۔

''اپنے دوست سے کہو برات لے کر آ جائے۔یہ جن مرچوں کی دھونی سے نہیں دولھے کی باس سے بھاگنے والے ہیں۔'' اس پر دونوں کے یکبارگی قہقہے بلند ہوئے۔وہ دونوں یوں ہنس رہے تھے جیسے اس کا وجود وہاں موجود ہی نہ ہو یا وہ اتنا غیر اہم ہو کہ اسے کوئی تسلیم ہی نہ کر رہا ہو سب نے کتنی آسانی سے اس کی نفی کر دی تھی جیسے اس کا نام کبھی ہاجو کے ساتھ جڑا ہی نہ ہو۔اور سب نے بشیر اور ہاجو کا جوڑ کیسے ایک دم تسلیم کر لیا تھا۔جیسے سب پہلے سے جانتے ہوں۔کہ یہ تو ہونا ہی تھا اس کے دماغ کے باریک ریشے جل اٹھے۔

''اماں!'' اس نے صدائے احتجاج بلند کی جیسے کہہ رہا ہو۔

''اماں! انہیں روک لو۔ورنہ پھر مجھ سے گلہ نہ کرنا۔''

وہ دونوں یوں چپ ہو گئے جیسے پوری آب و تاب سے جلتا ہوا بلب ایکا ایکی فیوز ہو جائے۔

اس رات اس نے اپنی اماں سے کہا ''اماں میرا ایک ارمان ہے۔''

ماں اس کی بلائیں لیتی ہوئی اس کے قریب آ گئی اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

''کہہ میرے لال ہزار بار کہہ۔''

وہ اپنا چہرہ اماں کے اتنا قریب لے آیا کہ اس کی سانسوں کا تعفن اماں کے چہرے پر محسوس ہونے لگا۔

''اماں! میرا ایک ارمان ہے۔'' وہ کہیں پاتال سے منمنایا۔

اماں بے تاب ہو اٹھی'' کہہ میرے لال تیری ماں تیرے صدقے۔ تیرا ہر ارمان پورا کرے گی۔''

اس نے اماں کے چہرے کو ٹٹولا جیسے پانی میں چھلانگ لگانے سے قبل کوئی شخص اس کی گہرائی کا اندازہ لگاتا ہے پھر آنکھیں موند کر کود پڑا۔

''میں...... چاہتا ہوں ایک بار سر پر سہرا سجاؤں۔ ہاجو کو دلہن بنا کر اس گھر میں لے آؤں۔ پھر سکون سے مر جاؤں۔''

اماں کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کی حسرتیں ابھی زندہ ہیں؟ اماں پوری جان سے لرز گئی۔

''کیوں نہیں بیٹے کیوں نہیں تو ذرا ٹھیک ہو لے نا پھر......'' اماں نے جھک کر اپنے آنسو چھپائے۔

''اماں تجھے یقین ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس کے چہرے پر عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ اور وہ چپ ہو گیا جیسے اب کبھی نہ بولے گا۔

اس سال بشیر نے جی توڑ محنت کی۔ اسے زیادہ فصل اٹھانے کی امید تھی۔ وہ اکثر رات کو سوتے وقت اپنے باپ سے فصل کے بارے میں باتیں کرتا اور اپنی ہر بات کا اختتام اسی بات پر کرتا۔

''میں چاہتا ہوں کہ بہت سے پیسے ہاتھ آئیں اور نجو کا ڈھنگ سے علاج ہو سکے۔'' اس وقت اندھیرا نجو کی آنکھوں میں بھر رہا ہوتا۔ ستارے ٹمٹما کر ٹوٹنے لگتے۔ تب وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتا اس کا انگ انگ خون تھوکنے لگتا۔ اس کے اندر بھڑکی آگ سینے کے حصار کو چیر کر باہر نکلنا چاہتی۔

ساؤنی کے دن قریب آ گئے تھے۔ فصل گھروں میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ بشیر جان توڑ محنت کر رہا تھا۔ وہ سوچتا یہ سب کچھ میری موت کے اہتمام میں ہو رہا ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت۔

وہ ان تمام گھناؤنے منصوبوں کو خاک میں ملا دینا چاہتا تھا۔ نفرت اور انتقام کا زہر اس کے روم روم سے پھوٹ نکلتا۔ آہ...... زندگی......۔

وہ چاند کی پندرہویں تاریخ تھی۔ آدھا آسمان بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا اور آدھا بالکل شفاف جیسے ایک آسمان دو کرڈں میں بٹ گیا ہو۔

بادلوں کے آخری کناروں پر بجلی کی دھاری سی یوں چمک جاتی جیسے سیاہ دوپٹے کے کنارے پر تلے کی لیس چمک رہی ہو۔

صحن میں ایک طرف مویشی بندھے تھے۔ جن کے سانس لینے کی آوازیں بڑی ہولناک تھیں۔ سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ سب کے خراٹوں کی آوازیں مل کر یوں معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے بھاری پتھر باہم رگڑ کھا رہے ہوں۔ اسے رہ رہ کر اپنی اس تائی پر غصہ آ رہا تھا۔ جس نے چاند کی ایسی ہی پندرہویں تاریخ کو اس پر تعویز ڈالے کہ وہ لہو تھوک تھوک کر مر جائے۔ اس نے سوچا اگر وہ زندہ ہوتی تو وہ اسے ضرور مار ڈالتا اور عورت کی گردن کاٹ ڈالنے کی تو ابھی اس کے ہاتھوں میں طاقت ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر بچھی بارودی سرنگیں یکدم ایک ایک کر کے خوفناک دھماکوں سے پھٹنے لگی ہیں۔ وہ بے قرار سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ بدلی کی اوٹ سے جھانکتے چاند کی شعاعیں ایک مرکز سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان شعاعوں کو اپنی تاریک آنکھوں میں سمیٹتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر انہیں دبوچ لیا۔ وہ بالشت بھر قوسی پھل والی کلہاڑی تھی۔ جس کی تیز دھار سے شرارے پھوٹ رہے تھے اور جو بشیر کی چارپائی کے پائے سے ٹکی تھی۔

اس کی گرفت کلہاڑی کے دستے پر آپ ہی آپ مضبوط ہوتی چلی گئی وہ بڑے غور سے بشیر کو دیکھ رہا تھا۔ بشیر کے صحت مند سینے کا زیر و بم صاف نظر آ رہا تھا۔ جو سراپا زندگی تھا۔ صحت مندی کی علامت، اس کے نزار جسم میں زندگی کی تمام تر باقی ماندہ قوت مجتمع ہو کر اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔ کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت ایک انجانی طاقت سے فولادی ہو گئی تھی۔ وہ بغیر پلک جھپکائے بشیر کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یکا یک اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور کلہاڑی کی تیز دھار بشیر کے سر کو چومتی ہوئی گزر گئی۔ نجو کا سارا ڈھانچہ چیخ اٹھا۔ ہڈیاں چرچرائیں اور سانس اکھڑ گئی اور وہ اوندھے منہ بشیر کے اوپر جا پڑا۔ بشیر ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا پھر اسے درد محسوس ہوا۔ ہاتھ سے پیشانی کو

چھوا۔ تو وہ عنابی ہو گیا اس نے زخم پر کس کے پگڑی باندھ لی اور بڑبڑایا۔ "یہ میرا دشمن کون ہے۔"

اور کھاٹ پر اوندھے پڑے شخص کو بغور دیکھنے لگا۔ جس کے بازو چارپائی کے نیچے کٹی شاخوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ منہ پر خون کی بوٹیاں چپکی تھیں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنس کر گم ہو چکی تھیں۔ ناک کا بانسا پھر گیا تھا۔ اور غلیظ مواد نتھنوں سے بہہ رہا تھا۔ "نجو! آواز نجا نے حلق کی کس نالی سے نکلی اور بے دم سیٹی کی مانند وہیں سٹ گئی۔ وہ کچھ دیر ساکت و جامد کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی سفید پگڑی میں سے خون کی پتلی عنابی دھار بہہ کر اس کے گریبان اور گردن کو بھگو رہی تھی پھر جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔

تیزی سے آگے بڑھا اور نجو کی نبضیں دونوں ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر یوں لوٹ سی پھیل گئی جیسے وہ بھی مردہ ہو گیا ہو اور اس کے اوپر گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔"

یہ عشق نہیں آساں

ڈھیڑ سے رنگین کبوتر بدن کا حصار چھوڑ کر پُھر سے اڑ جائیں اور پھر پھڑ اہٹ سی رگ و پے میں رینگتی رہے۔ نگاہوں کے، سوچ کے، کج زاوئیے۔ رنگین شیشوں سے بھائی دیتا دھرتی کا نقرئی پیراہن اَن دیکھے رنگ، نامانوس خوشبوئیں۔ ان سنے نغمے، انجانے مناظر ہر لمحہ ایک حادثہ، ہر پل ایک انکشاف، دبیز پردوں کی وحشت، کھوج کا از حد تجسس، مرجانا انتہائی سہل، جینا کرب انگیز لذت، یہ سب کچھ جس خاص عمر سے وابستہ ہوتا ہے، جو بس اسی عمر میں ہوتا ہے اور پھر کبھی نہیں ہوتا۔ شہزاد اسی دور سے گزر رہا تھا۔

وہ صبح سکول جاتا، سہ پہر کو لوٹتا اور باقی وقت کتابوں میں گم رہتا اس کے اساتذہ اور والدین کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، وہ ہمیشہ پوزیشن لیتا رہا۔ وظیفہ حاصل کرتا۔ سر عبداللہ کو یقین واثق تھا کہ شہزاد بورڈ میں پوزیشن حاصل کرے گا۔

''شہزاد! تم میرا نام روشن کرو گے۔''

''جی سر'' وہ مئودب اور ہونہار طالب علم شوقِ علم اور جستجوئے دانش کے بار تلے سر جھکا دیتا۔

''اور مجھے عاشی سے بھی بڑی امیدیں وابستہ ہیں وہ بھی ان شاءاللہ بورڈ میں کوئی پوزیشن ضرور لے گی۔''

سرعبداللہ آنکھوں میں امید کی روشنی بھر کر کہتے۔

عاشی بھی اسی کی طرح شہر کے انتہائی باعزت اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب عاشی کی ٹیوشن ختم ہوتی تو شہزاد کی ٹیوشن شروع ہوتی۔ آنے جانے میں دونوں کی اکثر مڈبھیڑ ہوتی اور بس۔ دونوں انتہائی ذہین اور محنتی بچے، کتابوں کی سرحد سے پار نگاہ کی رسائی نہ تھی۔ علم و دانش کی جستجو کے سوا کوئی جستجو نہ تھی۔

امتحان سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک تو شہزاد لمبی تان کر سوتا رہا اور امتحان کی تکان اور اکتاہٹ دور کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ تو مانو جامد ہی ہوگئی۔ جتنی کوشش کرتا پھیلتی ہی چلی جاتی۔ آخر وہ کیا کرے۔ روم روم میں بہتی حرارت، بخار آلود حسیات، ذہن اور بدن کو نچوڑتی ہوئیں، جیسے بیلن میں آیا گنا، تب اس نے فلموں کا سہارا لیا۔

ہوشربا مناظر جھنجھوڑتے گدگداتے تو رواں رواں مانو آنکھ بن جاتا۔ احساس بن جاتا۔ وہ تصویر ساکت کر دیتا۔ پردے سرکنے لگتے۔ آگاہی کا کرب یوں بے بس کر دیتا کہ وہ ہونکنے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ دشمنان دین و دل اس طور دل و دماغ میں رچ بس گئیں جیسے خالی غبارے میں ہوا بھر جائے اور غبارے کے پھٹ جانے کا دھڑکا سا لگا رہے۔ تب وہ مرنے کے مختلف طریقے ڈھونڈنے لگا۔ تبھی اس کا نتیجہ آگیا۔

اس کی بورڈ میں پوزیشن تو نہ تھی ایک دو نمبروں سے پوزیشن لینے سے رہ گیا تھا۔ البتہ عاشی بورڈ میں پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ شہزاد کے والدین اور اساتذہ یوں خوش تھے جیسے اس نے میٹرک کا امتحان پاس نہ کیا ہو بلکہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پاس کر کے ڈاکٹر بن گیا ہو۔ اسی رات عاشی کا فون آگیا۔ وہ اسے مبارک باد دے رہی تھی۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی لیکن پتہ نہیں کیا ہوا تھا کہ شہزاد کے ہاتھ نازک کونپلوں کی مانند لرزنے لگے۔ اور لفظ حلق میں اٹک گئے۔ البتہ عاشی بڑے اعتماد سے بولتی رہی۔ اس نے اپنے پڑھنے کے پروگرام کے متعلق بتایا ان پروفیسرز کے متعلق بتایا جن سے اس نے ٹیوشن پڑھنی تھی وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانا چاہتی تھی، اور شہزاد کا بھی یہی ارادہ تھا۔ اس رات شہزاد نے اپنی ایف ایس سی کی کتابوں کو کھولا، ہر لفظ، ہر سطر، ہر صفحے پر اک نگارخانہ سا بن گیا۔ عاشی کی ابھرتی، گم ہوتی شبیہیں، عجب حاضر غائب کا کھیل تھا۔ اسے وہ دکھائی دی درختوں

میں، بادلوں کے غبار میں، افق کی شفق میں اور غائب، انتہائی دلچسپ آنکھ مچولی کا کھیل تھا۔ اسے مزا آنے لگا۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل، یہ خوابوں کے دراز سلسلے۔ اس کے جلتے بلتے وجود پر برف کے پھاہے سے رکھ گئے۔

اگلے روز جب وہ سر منیر سے ٹیوشن پڑھنے گیا۔ تو عاشی ٹیوشن ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا، اور جامد ہو گیا۔ عاشی نے اسے دیکھا۔ نازک سے عنابی ہونٹ سکیڑے ہونٹوں کے گوشوں میں ننھے منے گڑھے سے پڑ گئے اور کہیں دھماکہ ہو گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا وہ بیٹھی، ڈرائیور نے دروازہ بند کیا وہ چلی گئی۔ یہ سب کچھ ایک جادوئی کرشمہ تھا۔

کسی نے منتر سا پڑھا، پھونکا اور اسے پتھر کی مورتی بنا دیا۔

رات کو عاشی کا فون آ گیا'' تم اتنے گھبرا کیوں رہے تھے۔'' وہ مزید گھبرا گیا'' اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے پسند کرنے لگے ہو۔'' عاشی کی آواز پر اعتماد تھی۔ شہزاد کو محسوس ہوا کہ یہ لفظ نہیں تھے بلکہ کوئی زود اثر نشہ تھا جو اس کے دماغ، سوچ، بدن اور حرکت و عمل کے پورے نظام کو مفلوج کر گیا۔

کبھی کبھی پوری دنیا اور دنیا کے تمام تر لوازمات نفی ہو جاتے ہیں اور محض ایک جذبہ، ایک وجود، ایک عمل اس کا محرک ہوتا ہے۔

''میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک جادوگرنی کسی شہزادے کو طوطا بنا کر ساتھ لے جاتی ہے اور اسے پتھر کے مٹھ میں قید کر دیتی ہے۔ کہیں تم وہی جادوگرنی تو نہیں ہو۔''

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ نازک نازک بیجوں پر پڑا کہر سا چھٹ گیا۔ اور روئیدگی کے لیے فضا سازگار ہو گئی۔

گرم کیسلے بھاپ سے سانس لیتی دھرتی شبنم کی بوندوں میں نہا گئی۔

وہ ٹیلی فون پر پہروں باتیں کرتے، ایک دوسرے کو سنتے، اس لوسٹوری پر تبادلہ خیال کرتے جو انہوں نے فلم کی شکل میں دیکھی تھی جس کا ہیرو اور ہیروئن انہیں کی عمر کے ہوتے تھے۔ کیسے آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ بے دھڑک سماج سے ٹکرا گئے تھے۔ دنیا اور سماج کے تمام بندھن توڑ کر دور نکل گئے تھے کسی پہاڑ کی کھوہ میں، کسی خوفناک جنگل میں، کسی لق ودق صحرا میں، جہاں انسانی زندگی کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ کیسے سکون اور مزے سے گزران کرتے تھے۔ ان کے اردگرد پھول کھلتے تھے۔ پرندے

محبت کے گیت الا پتے تھے۔موسموں کی سختیاں نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھیں ۔وہاں محض ایک ہی موسم رہتا تھا۔ پیار کا موسم ،جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ آتی تھی۔شہزاد اور عاشی اس فلمی جوڑے پر رشک کرتے ۔ ان کی باتیں ،اور حرکات وسکنات یاد کر کے محظوظ ہوتے ۔ ہنستے اور کبھی روتے ۔انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اس ویرانے میں وہ کھاتے کہاں سے ہیں۔جنگلی درندوں اور دیگر بلاؤں سے کیونکر محفوظ رہتے ہیں ۔موسموں کے شدائد کے سامنے کیسے سینہ سپر ہوتے ہیں ۔ یہ سب سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔کتنا حسین تھا یہ پیار کا جزیرہ اور کتنا سہل تھا اس سے لطف اندوز ہونا۔

شہزاد اور عاشی رشک کی آگ میں جل بھن جاتے ،اپنے سماج کو کوستے ،جذبوں کی شدت کا اظہار کرتے اور اپنی موجودہ کسمپرسی پر ترس کھاتے ۔تب ان کی خواب گاہوں کی کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے لپٹی خوش رنگ بیلوں کی عطر بیز خوشبوئیں در آتیں ۔

اوران ریشمی پردوں سے لپٹ جاتیں ،جو مہین نقرئی ڈوریوں سے اٹکے ہوتے ،دیواروں سے لگی اونچے اونچے سرہانوں والی مسہریوں اور نازک نازک نرم گدوں پر کبھی کہنیوں کے بل کبھی الٹے لیٹے کبھی سیدھے ریسیور ہاتھ میں تھامے گھنٹوں باتیں ہوتیں ۔میوزک کے مدھم سروں پر مدھر سرگوشیاں کرتے ہوئے ۔اس دوران ملازم ٹھنڈی چائے یا گرم مشروب اٹھا کر ان کی جگہ تازہ اشیائے خورد ونوش رکھ کر دبے پاؤں باہر نکل جاتے ۔اور آئندہ حکم کے منتظر رہتے ۔

گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد ریسیور رکھتے تو پھر گھنٹی بج اٹھتی ،پہر گزر جاتے ۔رات صبح میں ڈھل جاتی ۔کبھی کسی فلم کا کوئی خاص سین سنانے کے لیے ریسیور ٹیلی ویژن کے سپیکر کے سامنے رکھ دیا جاتا تو کبھی کوئی گانا سنانا مقصود ہوتا تو ریسیور کے توسط سے سنایا جاتا ،وہ صرف ایک دوسرے کو محسوس کرنا چاہتے تھے ۔جب کبھی کتاب اٹھاتے تو ایک دوسرے کی شبیہیں لفظوں کے پس منظر سے جھانکنے لگتیں ۔ اور انگلیاں غیر ارادی طور پر ڈائل گھمانے لگتیں ۔کلاس میں غزلوں کی تشریح ہوتی ۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

دماغ نامعلوم دنیاؤں میں پرواز کر جاتا ۔پروفیسر کیا تشریح کر رہا ہے سننے کی ضرورت ہی کیا

تھی عملی تشریح تصور میں لہرا جاتی ۔۔

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نیم باز آنکھوں میں...... آنکھیں...... آنکھیں ۔ نشہ سا طاری ہونے لگتا، بہکنے لگتے ۔۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

برق رفتار گاڑی جب جھٹکا کر کھا کر رکی ۔ تو معلوم ہوا کہ نہ تو تیل ہے اور نہ ہی پانی ۔ دونوں اناڑی ڈرائیور گھبرا گھبرا گئے امتحان کی ڈیٹ شیٹ ہاتھ میں آئی تو معلوم ہوا کہ کسی کتاب کا پہلا سبق بھی یاد نہیں ۔ یہ دو سال نہ جانے کدھر گئے تھے ۔ مگر اب کیا کیا جائے ۔ رات دونوں کی ٹیلی فون پر تادیر گفتگو ہوئی ۔

عاشی نے کہا: ''امتحان میں فیل ہو جانا میرے نزدیک قطعاً اہمیت کا حامل نہیں میں نے زندگی کا سب سے بڑا امتحان پاس کر لیا ہے ۔ اور سب سے بڑی سند حاصل کر لی ہے ۔ تم سے بڑی سند اور کیا ہو گی میرے لیے ۔''

''لیکن...... لیکن میرے والدین تو غم سے پاگل ہو جائیں گے جانتی ہو وہ مجھے ہر حال میں ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اور میری پچھلی کارکردگی ان کے اس خواب کو تقویت بخشتی رہی ہے ۔ میں تو کہیں بھاگ جاؤں گا مر جاؤں گا لیکن ایسا رزلٹ انہیں نہیں دکھاؤں گا ۔ شہزاد دہل رہا تھا ۔''

'' کیسے لڑکے ہو...... میں تمہارے لیے جان سے گزرنے کو تیار ہوں ۔

اور تمہیں اس بور امتحان کی پڑی ہوئی ہے...... ڈاکٹر بنوں گا...... ڈاکٹر بنوں گا ۔ کیا بچوں کی سی ضد لگا رکھی ہے ۔''

عاشی اس بدحواس لڑکے کی نسبت بہت سمجھ دار معلوم ہو رہی تھی ۔ ''تو پھر کیا کریں ہم ایسا برا رزلٹ بھی تو انہیں نہیں دکھا سکتے نا ۔''

''اس کا کچھ حل سوچو ۔''

''میں نے سوچ لیا ہے بس ان فاصلوں کو ختم کرو ورنہ......''

''شہزاد پلیز کچھ کرو۔ میں مر جاؤں گی۔''

''عاشی کے جملے شہزاد کے بخار آلود دل و دماغ کو یوں دہکا گئے۔ جیسے شیشہ پگھلانے والی بھٹی میں شیشہ پگھل جائے۔ یہ امتحانات، اسٹیٹس، مستقبل، مادی آسائشیں، معاشرتی اقدار یہ سب کچھ کتنا کمتر، کتنا بودا اور ہیچ معلوم ہونے لگا تھا۔''

عقل و شعور کی تمام تر کوتاہیوں سے بلند تر...... ہر دلیل، ہر سند، ہر ثبوت، ہر علت و معلول، ہر فلسفے سے بالاتر۔ ایک خیال ایک دھن، ایک احساس ایک ہی تصویر۔''

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

دو ٹکٹ شہزاد پہلے روز ہی خرید چکا تھا۔ جونہی گاڑی ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی۔ دونوں بھاگ کر سوار ہو گئے۔ دونوں کے دل اس شدت سے دھڑک رہے تھے کہ اس شدت سے تو ایکسپریس ٹرین نے رفتار بھی نہ پکڑی تھی، کمپارٹمنٹ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ کندھوں سے بیگ لٹکائے دروازے کے پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے یا بات کرنے کی ہمت نہ تھی۔ عورتوں کی لمبی لمبی لڑائیاں ٹھنیں، مردوں نے سیاست سے لے کر جہیز کے مسئلے تک تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث و مباحثہ کر ڈالا۔ کئی اسٹیشن آئے اترنے اور چڑھنے والے مسافر پاگلوں کی طرح دروازوں پر ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ پر وہ اپنی جگہ پر ساکت و جامد کھڑے رہے جیسے ڈر ہو کہ ذرا سا بھی ہلے یا جنبش ہوئی تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری یہ ریل گاڑی ایک خوفناک دھماکے سے اڑ جائے گی۔ نجانے کب کھڑکی کے قریب جگہ بن گئی تو ایک بزرگ نے کہا۔ بچو! بیٹھ جاؤ، گھنٹوں سے کھڑے ہو۔

یہ حکم ملتے ہی وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے سارا دن گزر جانے کے باوجود انہیں بھوک پیاس کا مطلق احساس نہ ہو رہا تھا۔ جسم اپنے نفسی تقاضے چھوڑ رہا تھا۔ آمنے سامنے بیٹھے کئی بار ان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ لیکن گڑ بڑا کر یوں ایک دوسرے سے نظریں چرا لیتے جیسے یہ جرم ہو اور وہ ارتکاب جرم میں دھر لیے جائیں گے۔

ہر اسٹیشن پر شہزاد اور عاشی کے ساکت کاٹھ کے جسموں میں جنبش پیدا ہوتی۔لرزا سا طاری ہو جاتا، اور پھر گاڑی کی سیٹی کے ساتھ کاٹھ کے یہ گڈا گڈی بے دم ہو جاتے۔ ہر اسٹیشن پر شہزاد سوچتا یہاں سے گھر کتنی دور ہوگا اور میری عالی شان خواب گاہ خالی پڑی ہوگی۔ باہر تاریکی میں لپٹے ہوئے مناظر گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ بھاگتے اور پھر بے بس ہو کر کھڑکیوں کے شیشوں سے لپٹ جاتے، کئی بار ان کے ٹکٹ چیک کیے گئے۔ٹکٹ پکڑاتے وقت شہزاد کی انگلیاں یوں اکڑ جاتیں، جیسے لکڑی کی تراش کر لگا دی گئی ہوں۔اور جوڑوں کے سپرنگ سختی سے کس دیے گئے ہوں۔کسی قصباتی اسٹیشن پر ایک سفید وردی والے نے جب ان کے ٹکٹ چیک کیے تو تیوری چڑھا کر بولا۔

''یہ محترمہ آپ کے ساتھ ہیں۔''

''جی جی...... ہاں''

لفظ شہزاد کے حلق میں سنگ ریزوں کی مانند اٹکنے لگے اور اس سہمے ہوئے نوعمر لڑکے کے چہرے پر صاف لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔''یہ خود آئی ہے جی میں نہیں لایا اسے۔''

اگلی صبح کندھوں سے بیگ لٹکائے وہ ایک اجنبی اسٹیشن پر اترے اور ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو اجنبیت اور بیگانگی کا احساس ایک مہیب خوف کی صورت میں کپکپی پیدا کر گیا۔

بلند چٹان پر واقع ایک ہوٹل کے استقبالیہ میں داخل ہوتے وقت دونوں کی حالت مفرور مجرموں کی سی تھی۔

''ایک ڈبل روم پلیز''

شہزاد کی آواز کسی گہری سرنگ سے ابھری اور وہیں دفن ہوگئی۔کاؤنٹر کلرک نے ایک بڑا سا رجسٹر کھولا اور نام و پتہ درج کرنے لگا۔

''رشتہ کیا ہے آپ دونوں کا۔''

''رشتہ'' شہزاد کے چہرے پر گمشدہ بچے کی سی یتیمی برسنے لگی۔

''ہماری منگنی ہوئی ہے جی'' عاشی کی آواز غیر معمولی طور پر بلند تھی۔

''منگنی'' کلرک کے ہاتھ سے رجسٹر چھوٹتے چھوٹتے بچا۔'' آپ لندن سے تشریف فرما ہوئے ہیں یا نیویارک سے''

''جی وہ ہماری شادی ہوگئی ہے'' شہزاد ہکلا رہا تھا۔

''کہاں ہے نکاح نامہ''

''نکاح نامہ...... وہ...... وہ تو جی گھر پر ہے۔''

''تو گھر سے بھاگ کر آئے ہو'' کلرک گرجا۔ بیٹھ جاؤ یہاں دونوں۔''

''ہلنا نہیں یہاں سے ابھی تمہارے ہنی مون کا بندوبست کرتے ہیں۔''

وہ دونوں پتھرا گئے، سوچنے سمجھنے اور بولنے کی قوت شاید کاؤنٹر کلرک نے اپنے لمبے سے رجسٹر کے ساتھ ہی بند کر دی تھی۔ تبھی چند نئے گاہک آ گئے۔ کلرک ان کی جانب متوجہ ہوا تو وہ دونوں بڑی خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل آئے۔ پھر سامنے کا ہر موڑ دیکھ کر ادھر ہی مڑتے چلے گئے۔

راستے بند، سمتیں مسدود، منزلیں ناپید،...... وہ کدھر جائیں۔ ٹیڑھی میڑھی گلیاں، چھوٹی اونچی نیچی دکانیں، تہ بہ تہ بنے مکانات کی ٹین کی چھتیں، اوپر سے نیچے تک پتھروں کو جوڑ کر بنائے گئے چھوٹے چھوٹے بے شمار گھر، لیکن ان کا گھر کدھر ہے۔ دن رات کھڑے رہنے سے پاؤں سوج گئے تھے ان کی معمولی جیکٹوں میں سردی گھس کر بیٹھ گئی تھی اور پورے جسم پر رینگ رہی تھی۔ بھوک نے معدے اور پیٹ میں ایک سرنگ بنا دی تھی جس میں وہ دھنستے چلے جا رہے تھے۔ لیکن اب کسی ہوٹل میں گھسنے کی ہمت نہ تھی۔ ایک قدرے سنسان جگہ پر وہ چٹان کا سہارا لے کر رک گئے۔ زرد پڑتے درخت چشمے اور آبشاریں، سب پر ہلکی سی سفید برف کی چادر بچھی تھی۔ پہلی بار دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ایک ہی جملہ دونوں کی زبانوں سے ادا ہوا۔'' کیسے ہو...... کیسی ہو''

پھر جیسے اس فضول سوال پر دونوں ہی پشیمان ہو گئے اور سر جھکا دیے کچھ توقف کے بعد عاشی نے کہا۔

''بیٹھ جاؤ، یہیں بیٹھ جاؤ۔ اب مجھ میں مزید چلنے کی ہمت نہیں۔'' وہ بیگ کو کندھے سے اتار کر یوں ڈھیر ہوگئی جیسے ٹوکری میں بھری مٹی کوئی یکدم الٹ دے۔

''بے وقوف نہ بنو، ہم یہاں پکڑے جا سکتے ہیں۔ ہر شخص ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔'' شہزاد نے سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، مگر عاشی نے سنی ان سنی کر کے جوتا اتار دیا۔ اس کے پاؤں سے خون پھوٹ رہا تھا اور چھالوں سے تلوے بھرے تھے۔

''دیکھو! اگر میں مرجاؤں تو مجھے اس چٹان سے لڑھکا دینا'' اس نے اپنی دھندلائی آنکھوں سے خوفناک گہرائی کی جانب دیکھا جہاں سپیڈ بریکرز کی مانند سیاہ چٹانیں ابھری تھیں۔

کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ہموار کر کے کوئی فصل بوئی گئی تھی اور یہ کھیت یوں تہ در تہ بچھے تھے جیسے زینے ہوں بے شمار زینے۔ ایک آبشار جو کہیں بہت اونچائی سے آتی تھی۔ اور سڑک کو کاٹتی ہوئی نیچے بہنے والے دریا میں گر رہی تھی جس کے سیاہ پتھروں پر سبز کائی جمی تھی اور اوپر برف کی ہلکی سی تہ چڑھی تھی۔ وہ ان بند، اندھے، دیوہیکل پتھروں میں کود پڑے۔ ان کے داہنے ہاتھ سیاہ پتھروں سے پھوٹتا ایک ننھا سا چشمہ تھا۔ جس کی سطح پر جمی برف کی تہ توڑ کر وہ یخ بستہ پانی منہ میں انڈیلنے لگے۔

''شہزاد مجھے کچھ کھانے کے لیے لادو'' عاشی منمنائی اور چشمے کی برف توڑ کر چبانے لگی۔ حلق سے اتارتے وقت اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار پھیل جاتے تھے۔

''برف مت کھاؤ میں نے سنا ہے یہ برف نقصان دہ ہوتی ہے۔'' شہزاد نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کچھ لے آؤ پلیز! کچھ کھانے کے لیے لے آؤ، زہر ہی لے آؤ۔''

عاشی کا خوبصورت چہرہ خوف، تھکن اور بھوک سے نڈھال ہو کر بدصورت لگنے لگا تھا۔ شہزاد نہیں چاہتا تھا کہ وہ پھر باہر نکلے لیکن اس نے تمام تر قوت مجتمع کر کے کہا:

''چلو پھر چلتے ہیں''...... ''نہیں تم جاؤ اور کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔ مجھ میں ایک قدم چلنے کی بھی ہمت نہیں۔''

شہزاد کا جی چاہا کہ وہ عاشی کے نرم زرد اور گرد سے اٹے رخسار پر زور سے طمانچہ دے مارے۔ لیکن کچھ دیر وہ اس نیم بے ہوش لڑکی کو غصے اور رنج سے دیکھتا رہا پھر بوٹ پہننے لگا۔ اس ٹیڑھے میڑھے بازار سے اس نے کھانا خریدا۔ واپسی پر وہ حیران رہ گیا۔ اسے کہاں جانا ہے۔ کدھر جانا ہے وہ آبشار کے قریب سے آگے بڑھا لیکن یہ تو وہ جگہ نہ تھی۔ جہاں وہ عاشی کو چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ کدھر سے آیا تھا، کدھر کو جانا تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ وہ ایک جانب دور تک جاتا اور پھر پلٹ آتا۔ پھر دوسری سمت نکل جاتا اور پھر پلٹ آتا مغرب کے وقت جب ایک ہی درے میں وہ چوتھی بار داخل ہوا تو عاشی کی چیخیں پہاڑوں

کے سنگلاخ سینوں سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں، وہ آواز کا تعین کرنے لگا۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں آواز گھوم کر آتی ہے" عاشی۔ عاشی۔" وہ پکارا۔" تم کدھر ہو"۔ فلک بوس چوٹیوں میں اس کی آواز کئی بار گونجی اور بکھر گئی۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی مگر وہ سمت کا تعین نہ کر پا رہا تھا۔ مزید آدھ گھنٹہ بھٹکنے کے بعد وہ عاشی کے پاس جا کر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ تاریکی پورے علاقے کو لپیٹ چکی تھی۔ یخ بستگی میں ٹھٹھری ہوئی ہر شے بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ شہزاد نے گرم قہوے کے چند قطرے عاشی کے منہ پر ٹپکائے تو کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ پھر دونوں ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے بعد جب سوچنے سمجھنے کی حس بیدار ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو وہی منظر ہے جو وہ بار ہا فلموں میں دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ بالکل ان جیسے لڑکے لڑکیاں، ایسے ہی ماحول میں ایسے ہی مناظر میں بالکل تنہا رات کے سناٹے میں گیت گاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ کہیں قریب ہی پہاڑوں سے بہتا ہوا پتھروں سے ٹکراتا پر شور دریا خوفناک آوازوں کے ساتھ گزر رہا تھا۔ وہ خوف کے مارے چٹانوں سے لپٹ گئے اور اپنے تمام کپڑے نکال کر جسم سے لپیٹ لیے۔ نجانے کیسے کیسے حشرات الارض اوپر نیچے رینگ رہے تھے۔ نوکیلے پتھر بدن کو خراشیں دے رہے تھے خوف اور سردی جسموں میں گڑ گئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی گرم خواب گاہوں میں گداز کمبل لپیٹے خشک میوے چباتے ہوئے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑے مزے مزے کی فلمیں دیکھ رہے ہوتے تھے۔

"فلمیں" شہزاد نے نفرت سے دہرایا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"آج ہم یہاں مر جائیں گے۔" عاشی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں"

"شہزاد کی آواز لرزاں تھی اور اس کی ذمے دار تم ہو گی۔ تم......"

"میرے والدین تو پاگل ہو جائیں گے میں ان کا اکلوتا...... بیٹا......"

"میرے والدین نہیں ہیں کیا۔" عاشی کے حواس پورے طور پر بحال نہ ہو رہے تھے...... انہیں کیا ہو گا۔ خوش ہوں گے کہ تم جیسی لڑکی......"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" برف کا ایک جھالا سا عاشی کے منہ پر برسا وہ سسکنے لگی۔" میں صبح تک زندہ نہ رہوں گی۔ مجھے یہیں برف میں دفن کر دینا۔"

"تمہیں ہی شوق تھا۔ پہاڑوں کی کھوؤں میں رہنے کا۔ رہو اب مزے اڑاؤ۔"

ایک مہیب سا پرندہ غار کی چھت سے نکلا اور خوفناک پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کی۔ عاشی کی چیخ نکل گئی۔ ''مت چیخو'' شہزاد دہاڑا۔ ''کوئی سن لے گا اور پکڑ کے لے جائے گا۔'' عاشی کی پھر چیخ نکل گئی۔

''لیکن تمہیں کیا۔ مارا تو میں جاؤں گا۔ میرے والدین...... میں اکلوتا'' شہزاد کی آواز بھرا گئی۔

کہیں کسی چٹان میں دراڑ سی پڑی اور بہت سے پتھروں کے ٹکڑے گرنے لگے۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں پتھروں سے لپٹ گئے۔ اس لمحے شہزاد نے سوچا کل اس کا کون سا پیپر ہونے والا تھا۔

شاید فزکس، یا شاید کیمسٹری...... یا...... او خدا...... اس کا شاندار مستقبل، اعلیٰ مقام و مرتبہ، پر آسائش زندگی سب کچھ...... سب کچھ داؤ پر لگ گیا۔ اللہ کیا میں اتنا پاگل تھا، میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نہیں ایسا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا کوئی احمق یا خبطی بھی نہیں۔''

''شہزاد! چائے کا ایک گھونٹ دے دو'' عاشی منمنائی۔

''خالی ہے تھرماس'' اس نے تھرماس اس کی جانب پٹخا۔

''برف چبالو چشمے کی...... بڑا شوق تھا تمہیں، ابلتے چشمے، گنگناتی آبشاریں۔''

''کیوں جلاتے ہو...... میں نے غلطی کی تو سزا بھی تو بھگت رہی ہوں، مر رہی ہوں اور کیا چاہتے ہو تم۔''

''میں اتنا احمق...... اتنا...... اتنا......'' وہ اندھیرے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''سن لو عائشہ بیگم!'' اس نے ہوا میں بازو لہرائے۔

''میں صبح جا رہا ہوں واپس اپنے گھر...... مجھے ان سنگلاخ چٹانوں میں دب کر مرنا ہرگز قبول نہیں ہے۔ اگر آج رات میں بچ گیا تو پھر صبح میں ضرور چلا جاؤں گا۔ ہاں تم بھی جانا چاہو تو خود سے جا سکتی ہو۔ واپس اپنے گھر۔''

''صبح تک جیوؤں گی تو سوچوں گی نا'' عاشی کے لفظ گڈمڈ ہو رہے تھے شہزاد کا ایک بار جی چاہا کہ اسے چھو کر دیکھے وہ واقعی مر تو نہیں رہی۔ لیکن پھر اس نے اس ارادے کو فضول سمجھ کر ترک کر دیا۔ اور سوچا۔ یہ لڑکی، انتہائی بے وقوف اور جذباتی لڑکی۔ جو اس کے سامنے نوکیلے پتھروں میں دبی سردی کی کوکھ میں منجمد ہو رہی ہے۔ جس کے گلے سے مرتے ہوئے انسان کی سی کھڑکھڑاہٹ نکل رہی ہے۔ اور جس کا

خوبصورت جسم اکڑ کر نیم مردہ ہو چکا ہے۔ یہی...... یہی تو اس کی قاتل ہے۔اس کی حماقت کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے۔

''تبھی کہیں سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔خوف کی نوکیلی انگلیاں شہزاد کی جلد کے اندر سرسرانے لگیں۔کوئی ایک گھنٹے تک یہ خوفناک مقابلہ جاری رہا۔اور پھر خاموشی چھا گئی۔مگر شاں شاں کرتی ہوا، پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتی تو بہت سے پتھر، پانی اور برف کے ٹکڑے نیچے پھسلا دیتی۔تادیر یہ سب کچھ مہیب آوازوں کے ساتھ بہتا یا گرتا رہا۔اس عرصے میں عاشی شاید بے ہوش ہو چکی تھی یا شاید...... مگر شہزاد ابھی حواس میں تھا اور موت کو ہر لمحہ اپنی جانب بڑھتے ہوئے جاگتی آنکھوں اور زندہ حواس کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔وہ بالکل نہتا اس مسلح دشمن کے بالمقابل کھڑا تھا۔جو اسے دبوچنے کو فضا میں جست بھر چکا تھا۔پھر شاید وہ بے ہوش ہو گیا۔

اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی حرارت منجمد کر رہا تھا۔عاشی کے چہرے پر نوکیلے پتھروں کی ضرب سے جابجا خون پھوٹ رہا تھا۔ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔جبڑے پیوست تھے اور وجود کی گٹھڑی بے حس معلوم ہوتی تھی۔وہ ڈر گیا کہیں وہ مر تو نہیں گئی۔

اس نے چاہا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔تبھی اسے چند لوگ ایک گھاٹی سے اترتے ہوئے دکھائی دیے۔انہوں نے رائفلیں کندھوں پر سجا رکھی تھیں۔اس نے بدحواسی کے عالم میں عاشی کو جھنجھوڑا۔ بھاگ سکتی ہو تو بھاگ پڑو۔ورنہ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔''مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا۔'' وہ کراہ اٹھی۔''تو پڑی رہو میں جا رہا ہوں۔''وہ سرپٹ بھاگا۔

کچھ فاصلے سے اس نے مڑ کر دیکھا عاشی روتی چیختی گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی آ رہی تھی اور لوگوں کا گروہ اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔شہزاد میں زندگی اور قوت کی جو رمق بھی بچ رہی تھی اس نے دوڑنے میں جھونک دی۔عاشی کی دلدوز چیخیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں پر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

بھوک بھنور

سوہنے نے خیمے کی بھر بھری مٹی میں دھنسے چھوٹے سے انسان نما بھٹنے کو اپنی جگہ پر پڑے پڑے پاؤں سے ٹھڈا مارا اور وہ اچھلتا ہوا چھت کی سیاہ لکڑیوں سے جا ٹکرایا پھر منہ کے بل دھول میں آ گرا۔ اس کے باسی حلق چھوٹی سی بہتی ہوئی ناک اور آشوب زدہ آنکھوں میں دھول گھس گئی۔ نیم برہنہ جسم، بال، پلکیں، ابرو سب دھول کے لیپ میں چھپے تھے۔ لڑکے کے حلق سے گڑ گڑ گڑ کی کریہہ آواز نکلی اور گالوں پر تھپی دھول کیچڑ سا بن کر بہنے لگی۔

''اٹھا لے کٹورا اور دفع ہو جا'' سوہنا گرجا۔

لڑکا دھول میں دھنسا کٹورہ اٹھا کر روں روں کرتا باہر نکل گیا۔

''ہاں سن'' آج کہیں سے گڑ بھی مانگ کر لانا۔ روٹیاں چپڑی ہوئی ہوں، آج کل کسانوں کے ہاں گڑ مکھن کی تھوڑ نہیں ہے۔ مانگنے کا ڈھنگ ہی نہیں آتا کم ذات کو...... اس رونی صورت پر کسی کو رحم ہی نہیں آتا...... آنکھ پھوڑ دوں گا...... انگلیاں توڑ دوں گا...... ٹانگ، ہاں ٹانگ...... اور جلدی واپس آ...... مجھے رات کا بھی فاقہ ہے۔''

لڑکا چھوٹے چھوٹے غلیظ ہاتھوں میں ایلومینیم کا ٹیڑھا میڑھا کٹورا پکڑے دوسرے بھک منگوں کے ساتھ بستی کی طرف چلا گیا۔ اور سوہنا خیمے میں پڑا پڑا اناج اور کسانوں سے بھرے کھیتوں کو

دیکھتا رہا۔

رنگ برنگے آنچلوں والی عورتیں اپنی مضبوط ہتھیلیوں میں ناڑ کے رسے بٹ رہی تھیں، اور گندم کے بڑے بڑے گٹھے باندھ رہی تھیں کٹے ہوئے کھیتوں میں پرندوں کی ڈاریں غوطے لگا کر اتر آئی تھیں۔ دھول اور حرارت کا ملگجا غبار ہر سو چھایا تھا۔ سوہنے نے بھرے بھرے کولہوں والی جفاکش کسان عورتوں کو دیکھا جن کے دوپٹے سر کے گرد لپٹے ہوئے چوٹیوں کو بل دیتے پیچھے لٹک رہے تھے اور کمریں کڑی کمان تھیں۔ اس کے کلیجے میں تیر کی انی گہری اتر گئی۔

''مرگئی...... مرگئی کم بخت!'' وہ خیمے کے موٹے میل خورے کپڑے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چھت کی درمیانی چوب میں بشیراں کا لال دوپٹہ اٹکا تھا۔ جس پر دھول کی موٹی تہ جمی تھی۔ سوہنے کے پورے وجود میں ایک عجیب سی نفرت نے جھرجھری لی۔ مرگئی۔ مرگئی کم ذات! ذرا سی بیمار کیا پڑی...... نازک مزاج...... اب میں اس کی لاش بیچ کر بیاہ کروں گا؟'' اس نے کھنگار کر دھول بھرا کف باہر پھینکا۔ اس کی کوئی بہن نہ تھی، بیٹی بھی نہ تھی، حتی کہ ماں بھی مرچکی تھی۔ اب وہ کس کے وٹے میں شادی کرے گا؟

اس کے سامنے اور دائیں بائیں پھیلے بسیط کھیتوں کے آخری کناروں پر آسمان اپنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ سورج ہر سو بچھ گیا تھا اور اپنی بھسم کر دینے والی گرمی کسانوں کے نیم برہنہ جسموں پر پھینک رہا تھا۔ کھیتوں کی طرف جاتی پگڈنڈیوں پر عورتوں کے قافلے سروں پر چنگیریں اور لسی کے مٹکے سجائے قطار اندر قطار رواں تھے۔ عورتوں کی بل کھاتی کمریں اور کولہوں کو چومتی ہوئی لمبی چوٹیاں لہرا رہی تھیں۔

''ذرا سی کیا بیمار پڑی کہ مرگئی اشناک نخریلی۔ ایک بیٹی ہی دے جاتی۔''

سوہنا تیورا کر اٹھا اور باہر آ گیا۔ تمام خیمے جلتی دھوپ میں لپٹے سلگ رہے تھے۔ جانوروں کے ڈھچروں، کھوپڑیوں اور پرانی ہڈیوں پر اوندھا پڑا رحموں خون تھوک رہا تھا۔ جیسے بے آواز نلکا چل رہا ہو سانول کے خیمے کا کپڑا اطراف سے اٹھا کر چھت پر اکٹھا کر دیا گیا تھا اور آڑی ترچھی چوبوں کے درمیان بیٹھے مرد پیسے لگا کر تاش کھیل رہے تھے۔ چند ایک ادھر ادھر چرس کے نشے میں دھت اوندھے پڑے تھے۔ اونٹ جھاڑیوں کو منہ مار رہے تھے اور کتے مٹی سونگھ رہے تھے۔ دھول کے جلتے بلتے بادلوں میں سے اس نے سرسری نگاہ پورے ماحول پر ڈالی اور واپس اپنے خیمے میں آ گیا۔ چاچی چنو کے بیٹے سانول

نے اسے آواز دی۔

''اوئے سوہنے! آ جا تاش کی بازی لگائیں...... چل تیری بازی ادھار سہی۔ اوئے ادھار ہی سہی۔''

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا، رات کے فاقے سے پیٹ میں دلدل سی بن گئی تھی۔ جس میں بل کھاتی کمریں اور بھرے بھرے کولہے دھنستے چلے جا رہے تھے اور وہ گھٹنوں گھٹنوں گڑ گیا تھا۔

وہ حلق میں باسی کف کا ذائقہ محسوس کرتا چیتھڑوں میں لپٹا پڑا تھا۔ جب موہنا روٹیاں مانگ کر لے آیا۔ وہ دونوں بڑے بڑے نوالے منہ میں ٹھونسنے لگے۔ لڑکے نے گڑ کی ٹکیا کو دانتوں تلے نکوسا، سوہنے نے ہاتھ مار کر ٹکیا نیچے گرا دی پھر جھپٹ کر گالوں میں ٹھونس کر اسے حلق میں نگلتے ہوئے ایک جھانپا لگایا۔

''اوئے اناج کے دشمن! تیرا مجھے کیا فائدہ؟۔ اب وہ کتیا بھی پلا جن کر مر گئی۔ ارے تو لڑکی کیوں نہ ہو گیا۔ پیٹ کا دوزخ'' لڑکے کے حلق سے گڑ گڑ گڑ کی قبیح آواز پیدا ہوئی روٹی کے ذروں بھری رالیں موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے ٹپکتی ٹھوڑی کو چومتی نیچے گرنے لگیں۔

اس روز وہ اپنے خیمے میں میلے چیکٹ چیتھڑوں میں لپٹا سو رہا تھا کہ سیانی اس کے خیمے میں داخل ہوئی۔ چھت کی چوب کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے ہوئے شان خسروانہ سے بولی۔

''سوہنا......!'' سوہنے نے چیتھڑوں میں سے منہ باہر نکالا۔ اس کے بالوں کے ٹوکرے میں دھول اور پرال کے تنکے بھرے تھے نتھنوں، کانوں کی لوؤں اور پلکوں پر دھول کی تہ چڑھی تھی۔ اور چہرہ گردن سے بالشت بھر آگے نکلا تھا۔

''سوہنے! تو بھی چھڑا ہے۔ میں بھی بڈھے سے کہہ کر آئی ہوں کہ اب تیرے پاس لوٹوں تو موئے کتے کا ماس کھاؤں...... چل دونوں مل کر رہیں۔''

سوہنا اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے گھوڑا فائر داغے جانے کا منتظر ہو اسے یہ آواز کہیں اپنے اندر سے آتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کی بینائی دھندلا گئی تھی۔

''کیا سوچ رہا ہے رے تو...... بات نہیں سنی تو نے میری؟''

خسرو اعظم کے مزاج میں تغیر آ گیا تھا۔ پھر جیسے فائر داغ دیا گیا، سوہنے کے منہ سے عجیب سی

بے معنی اور ہیجان خیز آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ جو جنونی قہقہوں اور اعصابی چیخوں کے درمیان تھیں۔ اس کے اعصابی ہاتھ چاک پر چڑھی مورتی کو متشکل کر رہے تھے۔ جیسے منقسم اجزا مجتمع ہو رہے ہوں۔ جیسے وہ خود اس کا تخلیق کنندہ ہو۔ پھر جیسے یقین آ گیا کہ یہ جیتی جاگتی سیانی ہے۔ محض اس کا واہمہ نہیں تو پھر وہ اس پانچ مربع فٹ کٹیا میں ایک بھرپور جذبات خیز اور ہیجان انگیز جنگلی رقص کرنے لگا۔ خیمے میں بھری دھول، چھت کی چوبوں، خیمے کے کپڑے، بے تحاشا ناچتے بُھتنے سب کو ہموار کر رہی تھی۔ سیانی بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہنستے اس کے ساتھ رقص میں شریک ہو گئی۔ ناچتے ناچتے سوہنے نے چھت کی چوب میں ٹھنسا لال دوپٹہ کھینچ کر باہر نکالا اور سیانو کو اوڑھا دیا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں پھر جیسے تمام طویل المیعاد اور قلیل المیعاد معاہدے طے پا گئے۔ اور وہ بے تحاشا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

تبھی خیمے کے کھلے در سے موہنا داخل ہوا۔ اس کی بغل میں بندھی جھولی میں روٹیاں اور کٹورے میں دودھ بھرا تھا۔ وہ خیمے کے در میں ساکت ہو گیا۔ ناک سے بہتی سنک موٹے موٹے سیاہ کھلے ہونٹوں کو چھو رہی تھی اور موٹی موٹی آنکھوں والی سبز مکھیاں ناک، کھلے منہ، آنکھوں کے کناروں اور چہرے پر جمی دھول پر بنی غلیظ لکیروں میں منہ مار رہی تھیں۔ اچانک سوہنے کی نظر اس پر پڑی۔

''اوئے ادھر لا کم بخت!'' اس نے کھینچ کر ڈھیلا بڑھے ہوئے پیٹ پر جمایا جو سوکھی سوکھی ٹانگوں پر یوں دھرا تھا جیسے بڑا سا کدو دو کمزور سے سرکنڈوں میں پرو دیا گیا ہو۔ لڑکے کے حلق سے عجیب سی آواز پیدا ہوئی...... گز گز گزا...... اور وہ اپنی کالی سانپ کی سی نوکیلی زبان نکال کر ہونٹوں پر بہتی سنک چوسنے لگا۔ شاید وہ رونے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے جھولی کھول کر پرال بھری دھول پر بچھا دی۔ رنگ برنگی، تازہ باسی، خشک وتر روٹیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ سوہنے نے اضطراری ہاتھوں سے روٹیوں کو مزید ادھر ادھر پھیلا دیا اور گڑ کی ڈلیاں اوپر سجاتے ہوئے بولا'' کھا'' سیانو بڑے بڑے نوالے گالوں میں ٹھونستے ہوئے بولی۔

''تو بھی کھا''

جیسے اپنے دسترخوان پر کسی گداگر کو آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ سوہنا دونوں ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر جھومتے ہوئے بولا:

''بس تو نے کھا لیا تو گویا میں نے کھا لیا...... اب تو کھائے گی اور میں تجھے بس دیکھوں گا۔''

سوہنو نے سیانو کا ذائقہ اپنی زبان کی نوک پر محسوس کیا، اور دانتوں تلے کرکراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے بولا۔ پیر دستگیر کی قسم! میں تو تجھے اپنی ران کا گوشت کاٹ کر کھلا دوں۔''

سیانو نے بڑے سے نوالے کو گال میں بھرا اور گڑ کی ڈلی پر دانت نکوستے ہوئے بولی۔

''چل بشیراں تجھے روزی کا بہانہ تو دے گئی نا!''

سوہنو کا گلا بھر آگیا اور وہ اپنی آنکھوں کو بڑی بڑی سیاہ ہتھیلیوں میں مسلتے ہوئے بولا۔

''میں تو کہتا ہوں وہ بھاگوان مری ہی اس لیے کہ ہم دونوں مل سکیں۔

''اوئے کھچرا......!''

سیانو نے اس کی کمر میں زور سے دھپ جمائی اور سوہنو اپنے بدن کا جھولا جھولتے ہوئے بولا۔

''ایمان سے......ایمان سے!''اور کھانے میں شریک ہو گیا۔

''اوئے'' سیانو نے اسے گھورا جیسے کہہ رہی ہو۔ تو نے میرے دستر خوان پر آنے سے پہلے مجھ سے اجازت کیوں نہ لی؟۔''

''یہ ابھی......ابھی اور لے آئے گا......اوئے اوئے دفع ہو جا کیا بٹر بٹر دیکھ رہا ہے کھایا پیا آنکھوں سے نکالے گا کیا؟۔''

سوہنو نے کھینچ کر کٹورا اس کی بڑھی ہوئی توند پر مارا۔ موہنا جو اس دلچسپ تماشے کو خیمے کے در میں کھڑا محویت سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے کھلے ہونٹوں پر بہتی سنک کو چوسا اور حلق میں گڑگڑ کی آواز پیدا کرتا کٹورہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

دھول کے بگولے میں لپٹے اس چھوٹے سے بھتنے کو سیانو نے دیکھا اور بولی۔

''اچھا ہے یتیم بے چارہ!''

سوہنو اوپر تلے نوالے ٹھونستے ہوئے بولا۔

''ایمان سے اتنی روزی کما کر لاتا ہے۔ اتنی کہ ہم دونوں سے تو ختم ہی نہ ہو۔'' جیسے اپنا معقول مشاہرہ تفاخر کے ساتھ بیان کر رہا ہو۔

''چچ چچ...... بیچارہ لنگڑا ہے نا۔ اس لیے لوگ ترس کھا کر دے دیتے ہیں۔'' یہ بھی میں نے

ایمان سے...... میں نے خود ان ہاتھوں سے......'' سوہنے کی بے قابو ہنسی حلق میں کھڑ کھڑانے لگی اور نوالوں کے ذرے منہ سے اڑ اڑ کر چہرے پر بکھرنے لگے۔

سیانی نے اس کی کمر پر دو ہتڑ جمائے۔

''ہت تیری'' بڑا ظالم ہے رے تو''

وہ ہنستا ہنستا دُہرا ہو گیا اور اسے اچھو آ گیا۔ اس کا چہرہ دھول اور پیال کے تنکوں سے بھر گیا۔ اور نرگٹ کی ہڈی اور گلے کی نسیں تن کر ابھر آئیں۔

اس رات خانہ بدوشوں نے سیانی کی آمد پر ایک بھرپور جشن کا اہتمام کیا۔ عورتوں اور مردوں کا اجتماعی رقص مرغوں کی بانگوں تک جاری رہا۔ دھول آسمان تک اڑ رہی تھی۔ اور چمگادڑیں اپنے ٹھکانوں سے نکل کر فضا میں پرواز کر گئیں۔ اکتارے اور چمٹے بج رہے تھے۔ قہقہوں اور گیتوں کے تیز شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ تمام خانہ بدوش عورتوں نے سیانی کو دوپٹے پیش کیے چاچی چنو نے تو پورا سوٹ اسے دیا۔ قبیلے کے نمبردار بزرگ نے سوہنو اور سیانی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دونوں کی شادی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ بزرگ نمبردار کے اجازت دینے کے ساتھ ہی مبارک، سلامت کا ایک قیامت خیز شور اٹھا اور سوہنو اور سیانی دیوانہ وار رقص کرتے ہجوم میں گھس گئے اور یہ ساری مخلوق ناچتے ناچتے دھول میں لتھڑ پتھڑ ہو گئی۔ دہکتے الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے ہر شخص کی شناخت اور حدود معدوم ہو گئی تھیں۔

موہنو کو اگرچہ مرغوں کی لڑائی میں زیادہ دلچسپی تھی۔ لیکن آج کل اسے اپنے خیمے کے اندرونی حالات زیادہ ہیجان خیز معلوم ہوتے تھے۔ وہ بار بار روٹیاں مانگ کر انہیں دینے کے بہانے چلا آتا۔ اور اس وقت تک کسی کونے کھدرے میں کھڑا رہتا جب تک سوہنے کی ڈانٹ نہ پڑتی پھر وہ کٹورا اٹھا کر حلق میں ''گڑ گڑ گڑ'' کی آواز پیدا کرتا۔ موٹے موٹے ہونٹوں کو چوستا بستی کی طرف روانہ ہو جاتا۔

اس رات آگ تو چاچی چنو کے خیمے میں بھڑکی تھی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پوری بستی کو لپیٹ میں لے لیا۔ تمام لکڑیاں، کپڑے، پرال تڑ تڑ جلنے لگے، اونٹوں اور کتوں کی رسیاں کاٹ کر ابھی خانہ بدوش آگ خاموش کروانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ آسمان کا منہ کھل گیا۔ اتنی بارش ہوئی کہ آگ خود بخود سرد پڑ گئی۔ اور خیموں کے گڑھے پانی سے بھر گئے وہ رات خانہ بدوشوں نے بارش میں بھیگتے درختوں تلے گزاری اور اگلی صبح جب اپنے خیموں کی جگہ پر پہنچے تو خیموں کے گڑھوں میں بھرے پانی میں بھیک

مانگنے والے کٹورے، سیاہ پیندوں والے دیگچے اور بوسیدہ کپڑے تیر رہے تھے اور جا بجا جھاڑیوں پر رنگ برنگے چیتھڑے لپٹے تھے اور کچھ کیچڑ میں دھنسے تھے۔ سیانی تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے خیمے کے گڑھے کی طرف گئی۔ اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس وقت تک چیختی رہی جب تک سب لوگ جمع نہیں ہو گئے۔

موہنو کی جلی، بھنی پھولی ہوئی لاش خیمے کے پانی بھرے گڑھے میں تیر رہی تھی۔ بال، بھویں، پلکیں سب کوئلہ تھیں، ناک کی سفید ہڈی اور دانت گوشت سے خالی ہو کر نمایاں تھے اور گڑھے کے کناروں پر کتے لوٹ رہے تھے اور چیلیں اڑ رہی تھیں۔ سوہنو نے پگڑی آنکھوں پر کھینچی اور زور زور سے دھاڑیں مارنے لگا۔

''اے ہے اے......مت کر یہ کھیکھن۔''

چاچی چنو نے اس کے منہ سے پگڑی کا کپڑا کھینچ لیا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔'' چاچی تو تو بس'' اور سیانی کے پیچھے منہ چھپانے لگا۔ چاچی چنو نے اس کی پگڑی زمین پر بچھا دی اور تمام قبیلے کے مرد، عورتیں روپیہ دو روپے اس پر دھرنے لگے جلدی ہی خاک کو پیوند خاک کر دیا گیا۔

شام پڑتے پڑتے اکثر خیمے دوبارہ کھڑے ہو گئے تھے، مرد آگ جلا کر ان میں براجمان ہوئے اور عورتیں اور بچے بھیک مانگنے بستیوں میں روانہ ہوئے۔ سوہنا چاچی چنو کے بیٹے سانول کے ساتھ بیٹھا تاش کھیلتا رہا۔ سانول کی بیوی اور بچے بستی سے روٹیاں مانگ کر لے آئے تھے۔ خود چاچی چنو بیوہ ہونے کے ناتے بہت زیادہ خیرات کی مستحق ٹھہرتی تھی۔ سانول کی خوب مزے میں گزر رہی تھی۔

سوہنے کو بھی چاچی چنو نے کھانا دے دیا۔ اور رات گئے جب وہ کھانا کھا کر اپنے خیمے کی جگہ پر آیا تو سیانو خیمے کے کپڑے میں لپٹی سو رہی تھی۔ ساتھ ہی خیمے کے گڑھے میں پانی بھرا تھا۔ جس میں ایلومونیم کے کٹورے، دیگچے اور چیتھڑے تیرتے تیرتے کناروں سے لگ کر ساکن ہو گئے تھے۔ پرائمری سکول کی سفید عمارت کے چھتنارے درختوں کے ہیولے خوفناک ہو گئے تھے۔ اور ستاروں کا گھنیرا جال کھیتوں میں بچھ گیا تھا۔ سوہنو نے اس کے منہ سے کپڑا کھینچتے ہوئے کہا:

''سب کے خیمے کھڑے ہو گئے، سب کو روٹی مل گئی۔ ایک تو ہے جو مُردوں کی طرح ٹانگیں پسارے پڑی ہے۔ موہنا مر گیا ہے اب عورتوں کی طرح کام کر۔'' سیانو نے کپڑا نوچ کر پرے پھینکا اور تنتنا کر اٹھی۔

''ارے صبح کی بھوکی، پیاسی پڑی ہوں۔ میرا خیال بھی آیا تجھے خود تو کھا پی آیا ہے نا، جو باتیں بنا رہا ہے۔''

''یہ تیرا کام تھا کہ کما کر لاتی اور مجھے بھی کھلاتی۔'' سوہنے نے خیمے کا کپڑا خود پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

''اے تو مجھے روزی کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے..... موہنو سمجھا ہے رے مجھے؟'' سیانو کی آواز ساری آوازوں پر غالب آ رہی تھی۔

''اری چپ کر جا..... میں کہتا ہوں چپ کر جا۔ مرد سے منہ چلاتی ہے۔ بے حیا عورت!'' سوہنا کپڑا کھینچ کر پڑتے پڑتے پھر بیٹھ گیا۔

''اے لے مرد تو دیکھو نکھٹو!..... بے حیا تو ہے جو پڑ کر کھاتا ہے بے غیرت!۔''

''ہاں ہاں وہ تو مرد تھا نا تیرا بڈھا.....''

''ارے ایک لفظ نہ کہنا اس کے لیے..... کما کر کھلاتا تھا مجھے۔ بھیک نہیں منگواتا تھا..... تیری طرح نہ تھا بے غیرت، نامرد۔''

سیانو کمر پر ہاتھ رکھ کر تن کے کھڑی ہوگئی۔ تاریکی میں اس کے تاثرات تو دکھائی نہ دیتے تھے لیکن آواز کے حتمی پن سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑے جارحانہ ہیں۔ سوہنا کھسیانا سا ہو کر اٹھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے آگے سے زور کا دھکا پڑا ہو۔ اور پھر ادھ جلی خیمے کی چوب اٹھا کر پل پڑا۔ سیانو نے اس کے ہر وار کو ہاتھوں پر روکا اور کئی بار اس سے ڈنڈا چھین بھی لیا، وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

''ارے مجھے مارنا چاہتا ہے خبیث..... پہلے بشیراں کو کھا گیا پھر موہنو کو کھا گیا اب مجھے..... ارے مجھے..... میں نہ لگی جاؤں گی۔''

سوہنو کی لٹھ زمین پر پڑتے پڑتے کیچڑ سے لتھڑ گئی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کا سارا قبیلہ جمع ہو گیا۔ مردوں نے سوہنو کو گرفت میں لے لیا۔ اور عورتیں سیانو کو پکڑ کر چنو کے خیمے میں لے چلیں۔

مردوں کی گرفت میں جکڑے سوہنو کو اس نے کئی ٹھڈے مارے اور مسلسل مغلظات بکتی رہی۔ سوہنو نے اس کی بکواس سنی اور مردوں کی گرفت سے چھٹنے کی بار بار کوشش کی اور کئی بار لٹھ اٹھا کر چنو کے

خیمے میں بھی آیا۔لیکن عورتوں نے باہر دھکیل دیا۔وہ واپس اپنے خیمے کے گڑھے کے قریب کپڑے میں لپٹ کر پڑا رہا۔اس کے کانوں میں مسلسل سیانو کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''یہ بے غیرت مجھ سے کمائی کروانا چاہتا ہے ارے مجھ کو منگتی بنانا چاہتا ہے۔''

چاچی چنو نے سیانو کے سامنے کھانا رکھا اور بولی۔

''لے کھا اب زیادہ غصہ نہ کر سوانی مرد میں تو ایسی اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔تو کملی تو بات کو کھینچے جا رہی ہے۔''

''نہیں چاچی! یہ مرد نہیں ہے...... یہ نکھٹو! پتہ نہیں کیسے برداشت کیا میں نے اسے اتنے مہینے موا کہتا تھا کہ میں تو تجھے اپنی ران کا گوشت کھلا دوں۔ جانتی تھی یہ ساری بادشاہت موہنو کے سر پر ہے۔ یہ نکھٹو موا تو خود بھوکوں مرے گا مجھے کیا کھلائے گا بے غیرت۔''

''چل اب غصہ تھوک اور دونوالے کھا لے...... کھانے سے لڑائی تھوڑی ہے۔'' تمام عورتوں نے چاچی چنو کی تائید کی۔

اگلی صبح جب سوہنو ابھی سویا ہوا تھا کہ سیانو اپنے بوڑھے شوہر کے پاس جانے کو روانہ ہوئی۔ قبیلے کی تمام عورتوں نے اسے روکنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ چنوں نے اس کے پاؤں تک چھوئے لیکن وہ رکنے پر رضامند نہ ہوئی اور چیخ کر کہا۔

''چاچی مجھے اب نہ روکنا اب میں اس نکھٹو کے پاس رہوں تو موئے کتے کا ماس کھاؤں۔''

جب عورتوں کی تمام تر کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں اور سیانی اپنی راہ پر گامزن ہوئی تو چاچی چنو نے چلا کر کہا۔

''اوئے سوہنو! تیری جورو جا رہی ہے روک لے اسے۔اسے روک لے اسے۔''

سوہنو اٹھنا چاہتا تھا اور اس نے لپٹا ہوا کپڑا ابھی نوچ پھینکا تھا لیکن سیانو کی غیض وغضب میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

''چاچی اس کم ذات کا نام نہ لے میرے سامنے...... وہ میرا کون ہوتا ہے جو مجھے روک سکے۔ کیا رشتہ ہے اس کا مجھ سے؟۔''

عورتوں اور بچوں کا قافلہ سیانو کے ساتھ دور تک گیا۔لیکن جب وہ کسی طور نہ رکی تو مایوس قافلہ

لوٹ آیا۔ اور اپنے کٹورے اور لاٹھیاں اٹھا کر بستی کی طرف بھیک مانگنے روانہ ہوا۔

سوہنو خیمے کے کپڑے میں منہ چھپائے پڑا رہا۔ دھوپ کی حدت موٹے کپڑے کو تپا رہی تھی۔

عورتیں اور بچے جب اس کے قریب سے گزرے تو ہنسی میں لپٹی مشترکہ افسوسناک آوازیں آئیں۔

''چچ چچ...... بیچارہ'' اور پھر سرپٹ قدموں کی ٹاپیں جیسے اس کے سر پر سے گزرتی چلی گئیں۔''

درختوں کے سائے تلے بیٹھے کسان مکھن چپڑی روٹیاں کھا رہے تھے۔ اور ان کی عورتیں لسی کے کٹورے بھر بھر سامنے رکھ رہی تھیں۔ جب وہ جھکتیں تو کمروں میں ایک خم پڑتا جو خفیف سی جنبش کے ساتھ پورے وجود میں لہرا جاتا۔ سوہنو کے پیٹ میں بھوک نے سرنگ سی بنا دی تھی۔ اور وہ اس میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔ بستی کی عورتوں اور بچوں کا قافلہ بھیک مانگ کر لوٹ رہا تھا۔ تازہ تازہ تنوری روٹیوں اور مکھن کی مہک اس کے نتھنوں میں گھس کر پیٹ کی سرنگ میں اتر گئی۔ وہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے قہقہے لگاتے گزرتے چلے گئے جیسے ریس کے گھوڑے اپنے مضبوط سموں والی ٹاپیں اس کے بدن پر مارتے بھاگتے چلے جا رہے ہوں۔ سارا قافلہ آگے بڑھ گیا لیکن چنو جو سب سے آخر میں تھی۔ اس کے قریب رک گئی۔

''اوئے سوہنے...... سوہنے! ارے اٹھ مرد کا بچہ ہے کیا عورتوں کی طرح پڑا رو رہا ہے۔''

''چاچی! وہ چلی گئی''...... جیسے اس کے اندر کہیں موت سی واقع ہو گئی ہو۔

''ارے چلی گئی تو کیا ہو گیا۔ اب اس کا ماتم کرتا رہے گا۔'' تو گھبرو ہے بانکا ہے تیرے لیے عورتوں کی تھوڑ ہے۔''

کون دے گا چاچی! مجھے کون دے گا؟'' وٹہ میرے پاس نہیں، ٹکے میرے پاس نہیں'' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''وٹے اور ٹکوں کے بغیر بھی مل جائے گی۔'' چاچی چنو نے اپنی گٹھڑی اتار کر اس کے قریب رکھ دی۔

''کیسے چاچی...... چاچی کیسے......'' اس نے کپڑا نوچ کر اچھال دیا۔

''کون چاچی! کون آخر کون'' اس کا چہرہ گردن سے فٹ بھر آگے بڑھا تھا اور نرگٹ کی ہڈی لرزاں تھی۔

چاچی چنو نے اپنی گٹھڑی کھول کر چار بڑی بڑی تنوری روٹیاں نکال کر اوپر گڑ کی ٹکیا جمائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لے کھا..... صبح سے بھوکا پڑا ہے، ابھی تیرا خیمہ بھی گاڑنا ہے۔ شام تک کھڑا کردوں گی۔''

چاچی چنو کے چہرے پر عجیب سی حیا کی سرخی لہرا گئی۔

سوہنو نے بڑے بڑے نوالے اوپر تلے حلق میں ٹھونسے اور گڑ کی ٹکیا میں دانت گاڑ کر جھومتے ہوئے بولا۔

''میری چنو، میری اچھی چنو''

خواب کہانی

اس رات چاند بہت روشن اور پرنور طلوع ہوا تھا۔اُس کے بند پپوٹوں میں چاندی کے ورق سے بچھ گئے تھے اور اُس کی نیند کو اسی چاندی کے ورق میں لپیٹ دیا تھا۔تب بند آنکھوں میں چاندنی کی بساط پر ایک تعمیر شروع ہوئی ایک پراسرار اور سندر محل کی تعمیر پر ابتدا میں تو وہ حیران ہوئی۔لیکن یہ کام اتنا تجسس بھرا اتنا راحت آگیں تھا کہ وقت کا اس سے بہتر مصرف کوئی دوسرا اس کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔رات بھیگتی چلی گئی اور محل کی آرائش وزیبائش نکھرتی چلی گئی۔تبھی محل کے منقش در سے ایک شہزادہ در آیا۔شہزادے کے خدوخال وضع کرنے میں اسے کچھ وقت درکار نہیں ہوا۔بلکہ شہزادہ چشم زدن میں اپنے مکمل وجود کے ساتھ اس کے تصوراتی محل میں دبے پاؤں چلا آیا۔شہزادہ اس سے محوِ کلام ہوا۔ساعتوں میں قند گھل گیا کہ کسی نے بیدردی سے اس کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔کانوں میں گھلتے امرت سیسہ ہو گئے۔

''اے کام چور، کب تک پڑی رہے گی، یہ سارا کام کون کرے گا۔اللہ ایسی لاپروا لڑکی دیکھی نہ سنی۔''

پتہ نہیں دنیا کی تمام نازک اور خوبصورت چیزیں درشت اور بدصورت چیزوں کے پنجہ استبداد میں کیوں جکڑی جاتی ہیں۔

اس نے بے زاری سے آنکھیں کھولیں، تین مرلے کے اس تنگ وتاریک گھر میں وہ سب کچھ جمع

تھا جو اس جیسے کسی بھی گھر میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ تعفن، سیلن، بدبو، حشرات الارض، بے ترتیبی اور ان سب کے بیچ بے وقعت غیر اہم، لاتعداد انسان۔ یہ سب کچھ ایسے پنجرہ نما گھروں کے چوکھٹے میں کتنا فٹ آتا ہے۔ اس نے خوشبوؤں کے جام سے آخری گھونٹ بھرا اور اس طلسماتی دنیا کو خدا حافظ کہا کہ جس کا ساتھ محض بند آنکھوں کو ہی میسر ہے۔ یہ بند آنکھیں بھی کتنی ناگزیر نعمت ہیں۔ ٹین کے کنستر سے آٹا نکالتے ہوئے اس نے سوچا آٹا پھر ختم ہو رہا ہے۔ اس کم بخت کنستر میں آٹا ہمیشہ ختم ہی رہا ہے۔ یہ روٹی بھی کتنا سنگین مسئلہ ہے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کم از کم وہ زندگی سے اس مسئلے کو تو سرے سے ہی اکھاڑ پھینکتی۔ تب یکایک اس کے اندر کی بھولی بھالی طلعت اپنا روپ بدل گئی جو اپنے زرنگار محل کے بالا خانے سے چلمن ہٹا کر پوچھتی ہے۔ یہ سب لوگ شور کیوں مچا رہے ہیں؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے، انہیں روٹی نہیں ملتی۔ وہ اک شانِ بے نیازی سے حکم دیتی ہے روٹی نہیں ملتی تو ڈبل روٹی دے دو۔ کیک مٹھائیاں دے دو جو مانگتے ہیں وہ دے دو۔

ایسے موقعوں پر اماں کی شیر کی دھاڑ جیسی آواز اس کے معصوم تصورات کو چیر کر جیسے بھک سے اڑا لے جاتی۔

تب وہ شدت سے رات کی تاریکی چھا جانے کا انتظار کرتی کہ رات اس کے خوابوں کی امین تھی، اور دن حقیقتوں کا، گویا دن بھر وہ ایک ریٹائرڈ پرائمری مدرس کی بیٹی طلعت ہوتی لیکن شب کا اندھیرا جب چھا جاتا اور باہر کی دنیا سو رہی ہوتی۔ تب اس کے اندر کے جہان میں انگڑائیاں لے کر ایک نئی دنیا بیدار ہوتی۔ جو کچھ ظاہر ہوتا وہ چھپ جاتا اور جو کچھ چھپا ہوا ہوتا وہ ظاہر ہو جاتا۔ اور ظاہر کے چھپ جانے اور چھپے ہوئے کے ظاہر ہو جانے میں کتنا اسرار ہے۔

ڈھیر سے دن لد گئے وہ طلسماتی شہزادہ جو شب کے اندھیرے میں دبے پاؤں آتا ہے اور اس کی پوری ہستی کو خوشبوؤں کی لپٹوں میں ڈبو جاتا ہے وہ کہ جس نے اس کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک سانس پر غلبہ پالیا ہے وہ کہ جس کے قدموں کی آہٹ اس کے دل کی دھڑکن بن گئی ہے نجانے وہ کہاں ہے لیکن کہیں نہ کہیں تو ضرور ہے۔ مگر کیا وہ اسے کہیں پا سکے گی۔ تب وہ بہت ڈری اور اسے بہت دکھ ہوا۔ اگر وہ سنگ تراش ہوتی تو اس شہزادے کا ایک بت تراشتی اور پھر تمام عمر پرستش میں تیاگ دیتی۔ اسے جو بھی دو چار نوجوان نظر پڑے تھے، ایک بار ان کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے ضرور دیکھا تھا کہ شاید اس

شہزادے کی تصویر کہیں چھپی ہو۔لیکن پہلی ہی نظر اسے مایوس کر دیتی۔اس روز جب اس نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا اور مکان کے تھڑے پر کھڑے نوجوان پر اس کی نظریں پڑیں تو اس نے دروازے کی جھری کو مزید ذرا سا وا کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا۔تو نوجوان کی چھٹی حس نے گویا اسے اطلاع دی کہ کوئی لڑکی اسے دیکھتی ہے اس نے پیشانی پر جھولتے ہوئے بالوں کی لٹ کو جھٹکا دے کر مزید نیچے گرایا اور بڑی ملتجی نگاہوں سے سامنے کھڑی خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔جس نے نظریں ملتے ہی کھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔اور بند دروازہ لڑکے کا منہ چڑا تا رہ گیا۔طلعت کو شدید مایوسی ہوئی یہ تو اس کے طلسماتی شہزادے کی گرد کو بھی نہ چھوتا تھا۔یہ الگ بات کہ وہ نوجوان دنوں دروازے پر نظریں گاڑے ایک آس پر دھوپ میں جلتا رہا۔اور پھر ایک روز اس کی ماں پیغام لے کر آ گئی۔

گھرانہ شریف تھا لڑکا ملازم تھا، نک سک سے درست۔گھر میں ما نو سب اسی کے منتظر تھے۔ایسے تعفن زدہ سیلن میں تو بعض اوقات ایسی حسین صورتیں پڑی پڑی کائی زدہ ہو جاتی ہیں، گویا طلعت کا نصیب اچھا تھا۔لیکن وہ تو بوکھلا اٹھی۔ابھی تو اس کی تلاش ادھوری تھی۔وہ کیونکر اپنی جستجو پر مہر ناکامی ثبت کر دیتی۔کوئی تعبیریں نہ دے لیکن خواب بھی تو نہ چھینے۔کہ خوابوں کے سہارے بھی تو عمر بیت جایا کرتی ہے اور کون جانے کہ زندگی خواب ہے یا حقیقت۔لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ اماں ابا کی وفات کے بعد وقت نے اس پر فکر معاش کا بوجھ لاد دیا۔اور اس کا ایک سکول میں بطور معلمہ تقرر ہو گیا۔یہ اس کی زندگی کا بالکل مختلف دور تھا۔لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے اندر کی دنیا ہنوز جوں کی توں تھی۔شاید ہمارے اندر اور باہر کے حادثات باہم میل نہیں کھاتے۔اور پتہ نہیں ہم اندر کی دنیا کے سہارے جیتے ہیں یا باہر کی دنیا کے سہارے۔

معلمات کی رہائش گاہ اور سکول کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔درمیان میں ایک بازار پڑتا تھا۔جہاں بے شمار لوگ ہر وقت مصروف رہتے۔ان لوگوں کو اپنے کاروبار سے کم اور یہاں سے گزرنے والی معلمات سے زیادہ دلچسپی تھی۔طلعت جب پہلی بار یہاں سے گزری تو بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر عمر اور قماش کے شخص نے گردن موڑ موڑ کر اس کا دور تک جائزہ لیا، پھر سب نے اشاروں کنایوں سے اس کے بارے میں رائے زنی کی۔اور پھر اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔نوجوانوں کو اپنے لباس اور بالوں کے اسٹائل سے کچھ زیادہ دلچسپی ہو گئی۔''عروس جیولرز'' اور ''دلہن گارمنٹس'' والے

صبح سویرے کرسیاں فٹ پاتھ پر بچھا کر بیٹھنے لگے۔اسے دیکھتے ہی فی الفور اپنی کرسیاں پیچھے کھینچتے۔اس کے گزرنے کو رستہ بناتے اور خود کھڑے مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتے رہتے۔وہ ناک کی سیدھ میں نظریں جمائے بنا ادھر اُدھر دیکھے تیز تیز قدموں سے چلتی چلی جاتی۔جب سب نے اپنے اپنے ہتھکنڈے آزما دیکھے تو یکا یک سب اس کے مخالف ہو گئے۔

ایک دن جب وہ اپنے سکول کے رستے پر رواں تھی تو معمول کے لوگوں سے بالکل مختلف ایک اور شخص وہاں موجود تھا، جس کے وجود سے یہ انتہائی فضول سارا رستہ بڑا بارونق اور سجا سجا معلوم ہو رہا تھا۔وہ جو اس کے آگے آگے تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔دراز قد، چھریرا بدن نیلی پینٹ اور سفید قمیض پہنے سر پر دھوپ سے بچانے والا سفید ہیٹ رکھے۔وہ تیز تیز قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا جیسے کسی انتہائی ضروری کام سے جا رہا ہو۔یکا یک اس نے اپنی رفتار بہت آہستہ کر دی اتنی آہستہ کہ طلعت کو اس کے قریب سے گزر کر آگے جانا پڑا۔قریب سے گزرتے ہوئے طلعت نے کن اکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔وہ اتنا خوبصورت تھا کہ اگر کوئی اجنبی اسے کوئی نام دینا چاہے تو یقیناً شہزادہ ہی کہے۔جب طلعت اس کے قریب سے گزر رہی تھی تو وہ اپنی فائل پر نگاہیں جمائے کسی فکر میں غلطاں سا کھڑا تھا۔جیسے اسے احساس ہی نہ ہو کہ کوئی اس کے قریب سے گزر گیا ہے۔اس کی اس ادا نے گویا اس کا دل ہی تو موہ لیا۔تو کیا وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو گئی ہے۔اس کے دل نے جیسے کہا ''ہاں'' اور وہ پھولوں کی باس میں مہک اٹھی۔جس تلاش کی کوئی انتہا نہ تھی۔وہ اس کی انت پانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اگلے روز جب وہ سکول جانے لگی تو غیر ارادی طور پر اس نے آئینے میں اپنا سراپا کئی بار دیکھا۔اسے لگا جیسے وہ ایک رات میں ہی یونہی بلاوجہ نکھر آئی ہے۔گھر سے نکل کر جب وہ بازار سے گزر کر لمبی سڑک پر پہنچی۔تو اسے پھر وہی نوجوان اپنے آگے چلتا ہوا دکھائی دیا آج پھر بالکل کل والے انداز میں چلتے چلتے اس کی رفتار آہستہ پڑ گئی اور طلعت کو اس کے قریب سے گزرنا پڑا۔جب وہ اس کے پاس سے گزر رہی تھی تو اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جواباً غیر متوقع طور پر نوجوان نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔دونوں کی نظریں ملیں تو نوجوان کے ہونٹوں کے کونے پھیل گئے۔طلعت گھبرا کر آگے بڑھ گئی کتنا سحر تھا اس کی آنکھوں میں جیسے اندھیرے اجالے کا سحر زدہ ملاپ۔دوسرے ہی لمحے نوجوان پھر اس کے ساتھ تھا۔پھر سارا رستہ کبھی طلعت ایک قدم آگے ہوتی تو کبھی نوجوان.....سکول کے گیٹ میں داخل

ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا وہ ٹھہر گیا تھا دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو طلعت شاید مسکرا دی حالانکہ وہ یہ حرکت کرنا نہ چاہتی تھی۔نوجوان نے اپنے ہیٹ کو ہلکی سی جنبش دے کر اسے خدا حافظ کہا اور وہ بھاگ کر اندر گھس گئی دن بھر عجیب غنودگی کی سی کیفیت طاری رہی،کبھی دل بے تحاشا ہی دھڑکنے لگتا۔کبھی بے طرح بیٹھ جاتا۔اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔کہ کوئی اس کیفیت سے آگاہ تو نہیں ہو رہا۔

اگلے روز پھر کل والا عمل دہرایا گیا اور جب وہ اس کے قریب سے گزر کر آگے جانے لگی تو اس نے دبی سی آواز میں اسے مس کہہ کر پکارا اس ذرا سی نحیف آواز نے جیسے اس کے قدم زنجیر کر دیے۔

''مس یہ ایک درخواست ہے''اس نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھایا۔

طلعت نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''کس کی درخواست ہے''''بیماری کی''وہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے مسکرا رہا تھا۔

''تو پھر سکول میں پہنچا دیجیے۔''طلعت نے لاپروائی ظاہر کی۔

''نہیں آپ کی کلاس میں دینی ہے''وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

طلعت نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا۔جیسے اس کے لہجے کی سچائی کی اتھاہ پانا چاہتی ہو لیکن آج اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔

''نہ لیا تو''''تو کسی کا نام کٹ جائے گا ہمیشہ کے لیے''

اب وہ اپنے سکول کے قریب پہنچ چکی تھی۔اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔جیسے زندگی میں پہلی بار چوری کر رہی ہو۔پھر وہ کاغذ مٹھی میں دبا لیا۔دل عجیب الٹ پلٹ ہو رہا تھا اس نے سوچا خط رات گئے پڑھے گی۔لیکن یہ دل بھی عجیب شے ہے کھلبلی سی مچی رہی اس نے کلاس میں بیٹھے بیٹھے وہ نامہ وا کیا،موتیوں کے سے حرفوں پر نظریں پھسلنے لگیں۔

''میں نے خود کو ایسا خوش قسمت تو کبھی نہ تصور کیا تھا لیکن اب یقین آنے لگا ہے میں اپنے خواب کو مجسم دیکھنا چاہتا ہوں۔آج شام چھ بجے پرانی حویلی کے باہر آپ کا منتظر رہوں گا۔''

اس کی پور پور میں سنسنی دوڑ گئی۔جیسے برقی لہریں سی چل رہی ہوں دل کی بے ترتیب دھڑکن اس نے خود اپنے کانوں سنی،ان لفظوں کو بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نئے انداز کی سرشاری سے بھر گئی۔

پھر ایکا ایکی اسے ایک فکرمندی نے آلیا۔اس نے جو جگہ ملنے کو لکھی تھی وہ اس کی رہائش گاہ سے دور اور

ویران تھی۔ کیا وہ ایک اجنبی پر اتنا بھروسہ کر لے؟ اس نے سوچا ایک شخص ہی تو زندگی میں ملا ہے اگر وہ بھی کھو گیا تو یہ تلاش کا عمل کبھی بار آور نہ ہو گا۔ وہ ہاں اور نہ کی صلیب پر لٹکی ساری دوپہر سوچتی رہی۔ جب دیواروں کے سائے لمبے ہونے لگے تو یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بہترین کپڑے نکالے پہنے اور تادیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی، جیسے فیصلہ تو کہیں بہت پہلے صادر ہو چکا تھا محض وقت کی مہر تصدیق کا انتظار تھا۔ چھ بجنے میں ابھی کافی وقت تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ چھ بجے سے پہلے وہاں موجود ہو گا۔ عجیب تجربے سے دوچار تھی، تجسس بھی اور خوف بھی۔ واپس پلٹے تو تجسس و اشتیاق پاؤں کی زنجیر ہو جائیں۔ آگے بڑھے تو خوف قدم بوجھل کر دے۔ وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئی۔

اس نے دور سے دیکھا حویلی کی پچھلی طرف ایک سفید کار کھڑی تھی۔ جس میں تین چار نوجوان بیٹھے تھے۔ اور وہ کھڑا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ طلعت پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار صاف طور پر طلعت نے دیکھے۔ وہ بے چینی سے گھڑی پر نظریں جماتا حویلی کے سامنے کی سمت چلنے لگا۔ طلعت جو اس سارے عمل کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دم جیسے سارے معاملے کی تہ کو پا گئی۔ دہشت اور خوف اس کی رگوں میں سرایت کر گیا، وہ تیزی سے گھومی اور واپسی کے رستے پر پوری سرعت سے چلنے لگی۔ نوجوان لمبے قدم بڑھاتا اس کے قریب آ گیا اور بڑی خوابناک آواز میں بولا۔ ''مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گی۔''

طلعت نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی وہ تقریباً بھاگ رہی تھی۔

''آپ کی ہر ادا ہی جان لیوا ہے۔ اب قریب آ کر غزالوں کی مانند دور بھاگ رہی ہیں۔ میں اس ادا کو کیا نام دوں۔''

اس کا جی چاہا منہ نوچ لے اس فریبی کا۔ اب نوجوان نے ایک اور پینترا بدلا۔

''شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں وجہ جانے بنا آپ کو جانے نہیں دوں گا۔''

وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحے کے لیے تو اس کی رگوں میں اندھیرا اتر گیا۔ جیسے موت رینگ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں وحشت بھر آئی اور وہ جنونی انداز میں چلائی۔ ''ہٹ جاؤ میرے راستے سے احمق!'' نوجوان کے قدم جیسے اکھڑ گئے۔ تبھی اسے محسوس ہوا۔ وہ سفید کار اس کے ساتھ ساتھ چل رہی

ہے ایک اوباش نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔

''اے جی! کیوں خود کو اذیت دیتی ہیں۔ادھر گاڑی میں تشریف لے آیئے۔''خوف اس کی روح میں منجمد ہو گیا۔اس نے دوڑنے میں جیسے زندگی کی آخری رمق بھی صرف کر دی۔گھر پہنچ کر سیدھی اپنی کھاٹ پر ڈھیر ہو گئی۔

اس نے زندگی کی سب سے بڑی شکست کھائی تھی،کتنی گہری چوٹ۔اتنے بھیانہ جرم کی پاداش میں نہ کوئی اسیر ہوتا ہے،نہ ہی کوئی سزا بھگتتا ہے۔شاید اس لیے کہ اس جرم کی کوئی مادی شکل نہیں ہے۔

اسے لگا اس کا فلسفہ حیات ہی غلط تھا۔اس نے عمر کا پل پل جس ریاضت میں صرف کیا۔جب اس فلسفے کی تھیوری تیار ہو چکی تو اسے کہا گیا کہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے سو اسے زہر کا پیالہ پی کر مر جانا چاہیے۔

ناگفتہ بہ افسانے پورے شہر میں گردش کر گئے۔اس کی زبان اپنے ہی دانتوں تلے آکر بری طرح کچل گئی تھی۔تو کیا اب اسے مر جانا چاہیے،خدا دن رات بے شمار انسان تخلیق کرتا رہتا ہے،لیکن جینے کا حق کسی کسی کو دیتا ہے۔لیکن مرنا تو سب کے شکوک کو یقین میں بدل دینے کے مترادف ہے۔اگر جینا ذلت ہے تو مرنا اس سے بڑی ذلت تو پھر اسے جینا ہی چاہیے۔اور وہ زندگی کی تلاش میں ایک دوسرے نگر پرواز کر گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا روایتی دیہات تھا۔جہاں سکول کی عمارت تو خیر ابھی معرض وجود میں آئی ہی نہ تھی۔البتہ گاؤں کے زمیندار نے اپنے ڈیرے کی عمارت بطور مدرسہ دے رکھی تھی۔یہ عمارت خاصی بڑی تھی جس کے درمیان میں ایک ڈیڑھ فٹ اونچی دیوار کھینچ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ایک حصے میں بچیاں پڑھتی تھیں اور دوسرے حصے میں دن رات زمیندار کے دوستوں کی محفلیں اور پنچایت بجتی تھی۔یہاں سے ہر وقت اتنا شور اٹھتا کہ بچوں کا شور اس میں دب جاتا۔ہر طرف یہ بڑی بڑی مونچھیں،اونچی اونچی پگڑیاں اور دہکتی ہوئی چلمیں نظر آیا کرتیں ادھر کرسیوں پر بیٹھی استانیاں سب کی توجہ کا مرکز بنی رہتیں۔ایک جانب بڑے صاحب کی عدالت جمی رہتی تو دوسری طرف چھوٹے صاحب کی محفل بجتی۔ان کے دوستوں کی سواری پر سواری آکر رکتی۔تاش کی بازیاں لگتیں،پالتو کتوں،گھوڑوں، کبوتروں،بازوں،شکروں کی نسلوں،قسموں کی بڑائیاں بیان ہوتیں۔جھوم جھوم کر اپنی بہادریوں اور

عشق و عاشقی کے قصے سنائے جاتے۔ درمیانی دیوار اتنی مختصر تھی کہ بنا کوشش کیے سب کچھ نظر آتا رہتا۔ طلعت اس سارے ہنگامے کو دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔ لڑکیاں بھی ایسی بدتہذیب اور اجڈ کہ ایک دوسرے میں منہ چھپا کر ہنسنے اور آتی جاتی موٹروں کو گھورنے کے سوا انہیں کچھ آتا ہی نہ تھا۔ طلعت اس صورت حال پر حیران سی بیٹھی غور کر رہی تھی کہ تبھی چھوٹے صاحب اپنے دوستوں سے فراغت پا کر درمیانی دیوار کے قریب آ کھڑے ہوئے اور اس کی ساتھی استانی سے مخاطب ہوئے۔

مس سلمیٰ! یہ مس صاحبہ نئی آئی ہیں؟

سلمیٰ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور شوخی سے بولی۔

''ابھی تک تو نئی ہیں ہو جائیں گی پرانی بھی ایک دن'' اس پر دونوں کے مشترکہ قہقہے گونج اٹھے۔ تیسری استانی عذرا اپنی کلاس چھوڑ کر دیوار کے اس طرف چھوٹے صاحب کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور ان کے قہقہے بلند ہوتے رہے۔ پھر عذرا نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''سلمیٰ! یہ سکندر کی بات سنو! بڑے مزے کا پروگرام بنا رہا ہے۔''

اب سکندر نے خود ہی کہا۔

''مس سلمیٰ! کیوں نہ آج نئی مس صاحبہ کی آمد کی خوشی میں مل کر چائے پی جائے'' سلمیٰ نے اس تجویز کی بھرپور تائید کی اور دوڑتی ہوئی دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سکندر کی نظریں اسی پر جمی تھیں یقیناً وہی موضوع گفتگو تھی۔ اس نے کرسی گھما کر ان کی طرف سے پیٹھ کر لی۔ کچھ ہی دیر میں چند ملازم داخل ہوئے اور یہ لمبی سی میز بچھا کر اسے مختلف لوازمات خورد و نوش سے بھر دیا۔ جبھی عذرا اور سلمیٰ واپس آئیں اور ان کے پیچھے سکندر دیوار پھلانگ کر چلا آیا۔ اس نے آتے ہی طلعت کو سلام کیا اور کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور گویا ہوا:

''مجھے آپ کے آنے کی بہت خوشی ہوئی مجھے امید ہے آپ کا وقت یہاں بہت اچھا گزرے گا، میں معلمات کی بہت عزت کرتا ہوں آپ کو کسی قسم کا کوئی کام پڑے یا کوئی تکلیف ہو تو مجھے فوراً کہیے گا آپ کے کام آ کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

وہ خاموشی سے اس کی تقریر سنتی رہی اور ایک لفظ نہیں بولی۔

''اچھا تو اب بسم اللہ کیجیے'' وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموش بیٹھی رہی۔'' آپ تو بہت تکلف کررہی ہیں میں تو یکدم بے تکلف ہو جانے والا آدمی ہوں۔ شروعات میں مس سلمٰی نے بھی چند دن بہت تکلف کیا لیکن میں نے بھی کہا اس تکلف روسیاہ کو اتار نہ پھینکوں تو سکندر نام نہیں۔'' اس پر ایک فضول سا قہقہہ بلند ہوا قہقہے سے فراغت پا کر سکندر نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

''اب تو ہم بہت اچھے دوست ہیں مجھے یقین ہے آپ بھی ہماری بہت اچھی دوست ثابت ہوں گی۔ کیوں مس۔''

وہ تلملا اٹھی۔ ''نہیں چاہیے مجھے کسی کی دوستی۔''

''کسی کی نہ سہی سکندر کی تو چاہیے'' سکندر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

اس پر سلمٰی اور عذرا کے قہقہے ابھرے۔ وہ غصے سے کھول اٹھی۔

''آپ میرے اندازے سے زیادہ بدتمیز اور ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔'' اس نے ذرا جھک کر کہا۔'' شکریہ اس تعریف کا ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں آپ کے اندازے سے بڑھ کر اور بھی بہت کچھ ہوں اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اپنا تعارف کرا سکتا ہوں۔''

اس پر پھر عذرا اور سلمٰی کے فرمائشی قہقہے بلند ہوئے۔

''چھوڑو طلعت تم سکندر سے نہیں جیت سکتیں۔ ویسے یہ آدمی بہت اچھا ہے تمہیں اس کی دوستی تو قبول کرنا ہی پڑے گی۔''

سکندر نے کہا'' لیکن میں انہیں ناراض تو قطعاً نہیں کرنا چاہتا۔ بھلا انہیں ناراض کر کے کون کافر خوش رہ سکتا ہے۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔'' وہ مسخرانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

طلعت نے اپنی چادر اور پرس کھینچ کر اٹھایا اور طنز سے بولی۔

''اس مدرسے میں پڑھائی اور چھٹی کے شاید کوئی اوقات کار نہیں ہیں۔'' سکندر نے جھٹ سے کہا'' جی نہیں جب ہمارا جی چاہتا ہے ہم پڑھائی کر لیتے ہیں جب جی چاہتا ہے چھٹی کر لیتے ہیں۔ ویسے چھٹی ہمیں زیادہ مرغوب ہے۔''

''لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نہ آپ کی خواہش پر پڑھائی کر سکتی ہوں اور نہ

چھٹی''،اور پیر پٹختی اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی جو سکندر کے والد بڑے ملک صاحب نے ہی دے رکھی تھی۔جن سے وہ رات ہی مل چکی تھی۔ جو اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی آئے تھے۔اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس سے کسی بھی قسم کی ضرورت میں کام آنے کا وعدہ کیا تھا۔اسے نیا پا کر گاؤں کے بچے دھول میں لت پت اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔بچوں کے اس جلوس نے اسے رہائش گاہ تک پہنچا دیا۔

اس کے دماغ کی نسیں سکڑ کر سمٹ کر ٹوٹ رہی تھیں۔وہ بستر پر ڈھیر ہوگئی۔کوئی تو جائے پناہ ہو۔کیا وہ لوہے کا خول چڑھا کر خود کو دفن کر لے۔اگلے روز جب وہ مدرسے کی جانب گامزن تھی تو سکندر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔''مس طلعت! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنا تھی۔میں مانتا ہوں کہ میں بہت برا آدمی ہوں لیکن دل کا اتنا برا نہیں'' وہ زچ ہو کر بولی'' آخر آپ چاہتے کیا ہیں''،کیا مجھ سے شادی کریں گے؟''

وہ تیورا گیا۔کچھ دیر خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا پھر بڑی دھیمی لیکن واضح آواز میں بولا۔

''ہاں میں تم سے شادی کروں گا۔'' جیسے اس نے یہ فیصلہ ابھی اور اسی وقت کیا ہو۔

تو پھر ٹھیک ہے اس نے گہری سانس لی''ابھی اور اسی وقت چار بھلے مانس لے آیئے۔اور مجھ سے نکاح کر لیجیے میں رضامند ہوں۔''

''میں ابھی اور اسی وقت تم سے نکاح کروں گا'' سکندر نے اسی کے لہجے میں کہا۔''لیکن یہاں نہیں۔ہم ابھی اور اسی وقت شہر جائیں گے۔''

''ڈر گئے اپنے باپ سے''اس نے بھرپور طنز سے کہا۔

''ڈرتا نہیں ہوں میں کسی سے''اس نے سختی سے تردید کی۔

''اصل میں میری شادی ہو چکی ہے میرے دو بچے ہیں،میری بیوی میرے باپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔شاید وہ کچھ اعتراض کریں۔''

''لیکن جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں تم سے نکاح کر چکا ہوں تو پھر کچھ نہیں ہوگا۔ہمارے خاندان میں لوگ چار چار شادیاں بھی کرتے ہیں۔تم اس کی بالکل فکر نہ کرو۔یہیں ٹھہرو۔میں ابھی کار لے کر آتا ہوں۔دیکھو یہاں سے جانا نہیں۔میں ابھی آیا۔''

وہ تیز قدموں سے واپس پلٹ گیا۔وہ برگد کے خوفناک سے درخت تلے کھڑی رہ گئی جس کی

شاخوں سے چمگادڑیں الٹی لٹکی جھول رہی تھیں۔ اب سکول جانا فضول تھا اور واپس رہائش گاہ پر جانا اس سے بھی زیادہ فضول۔ وہ شیر کی کچھاڑ میں گھس کر اسے زخمی کر چکی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لاریوں کے اڈے پر پہنچی اور جو بس ملی اسی میں بیٹھ گئی۔ یہ سوچے بنا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

آخر وہ پناہ کی تلاش میں آپا کے پاس پہنچ گئی۔ شکست وریخت اس کے روئیں روئیں میں رینگ رہی تھی۔ آپا گھبرا اٹھیں ڈھیروں سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

''آپا! میں نے امان کی خاطر جس کھوہ میں بھی گھسنا چاہا وہی کسی درندے کا مسکن نکلا۔'' اس نے ٹوٹتے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

آپا! میں ڈار سے بچھڑی کونج ہوں جو شکاریوں کی زد میں رہتی ہے؟ آپا بولیں،''تو حوصلہ نہ ہار، تیرے بھیا کوشش کر کے تیرا تبادلہ کہیں اور کروا دیں گے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔''اور وہاں کوئی اور شکاری گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔''

آپا متفکر ہو گئیں''تو طلعت! تو شادی کر لے۔''

آپا نے جیسے اس کی تمام تر پریشانیوں کا حل تلاش کیا۔ وہ طنزیہ ہنس دی۔

کس سے آپا''''آخر کس سے''

آپا سوچ میں پڑ گئیں۔''وہ کیا بھلا سا لڑکا تھا۔ طلعت! تو نے اس وقت بڑی غلطی کی۔''

''اس وقت یہی ہونا تھا آپا۔'' اس نے گہری سانس لی۔

آپا کچھ سوچ کر بولیں''لڑکا تو ایک اور بھی ہے یہیں میرے پڑوس میں رہتا ہے برسرِ روزگار ہے لیکن''

''لیکن کیا آپا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔ آپا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔''لیکن لڑکے کی ٹانگ میں ذرا نقص ہے۔''

''یہی ذرا بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہے'' طلعت نے لقمہ دیا''ہاں بس یہی''

وہ زور سے ہنس دی۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر اتنا ہنسی، اتنا ہنسی کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا آپا نے جھٹ سے صفائی پیش کی۔''لیکن میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تیرا اس سے......''

''کیا مطلب نہیں تھا آپ کا'' اس نے سنجیدگی سے آپا کو دیکھا۔

''میں اسی سے شادی کروں گی۔ آپ اس کی ماں سے بات کریں''
آپا گھبرا گئیں۔ ''لیکن طلعت تو تو چاند ہے۔''
''چاند تو کب کا گہنا چکا آپا۔'' اس نے آنکھیں موند لیں۔
آپا کو محسوس ہوا۔ جیسے چودھویں کا پورا چاند گہن تلے آ کر سیاہ ہو گیا ہے۔

حسن کی دیوی

رسوئی کے بھنبھار سے در سے وہ کئی بار جھانک چکی تھی۔ باہر کا سارا منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ہمراہ ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑی بی بی جی بالوں میں تیل ڈلوا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کو ہدایات جاری کرتی جا رہی تھیں۔ بڑے ملک صاحب کا بیمار شکاری کتا اپنے بچھونے پر پڑا اونگھ رہا تھا۔ اور ایک چھوٹا لڑکا ہاتھوں میں مکھن کی گولی لیے اس کے جسم کی مالش کر رہا تھا۔ چھوٹا ملک افتخار ابھی ابھی اپنی دو نالی بندوق ہاتھ میں لیے باہر نکلا تھا۔ اس کے پاؤں تلے زمین دہلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور گردن کے اکڑاؤ کے ساتھ سر اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ اور سب سے چھوٹا ملک یعنی امتیاز کچھ دیر پہلے سکول سے لوٹا تھا۔ اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ رانو نے پھر باہر جھانک کر دیکھا، گڑ کی بوریوں میں سے جھانکتی ننھی منھی چوہیا نے دیسی گھی سے چپڑی روٹی کی حرارت پہ پگھلتے مکھن کے پیڑے کو حریص تشنہ نگاہوں سے تاکا اور پھر رانو کی آنکھوں میں مانوس چمک پا کر بوریوں میں منہ چھپا لیا۔ تبھی بی بی جی کی تحکمانہ آواز گونجی۔ ''رانو! دودھ کا گلاس گرم کر کے امتیاز کو دے آ......۔''

امتیاز قریبی قصبے کے ہائی سکول میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ روزانہ صبح ڈرائیور حکیم بخش کے ہمراہ سکول جاتا۔ سہ پہر کو لوٹتا اور شام تک باقاعدگی سے سکول کا کام کرتا۔

رانو نے کمرے میں قدم رکھتے ہی زور سے ہاؤ کیا اور امتیاز کے اچھلنے کے ساتھ ہی اس کے

ہاتھوں میں پکڑا دودھ کا گلاس ذرا سا چھلک گیا۔امتیاز نے دو قدم بڑھا کر گلاس میں سے دو گھونٹ بھرے۔ پھر گلاس رانو کے لبوں سے لگا دیا۔وہ غٹا غٹ پورا گلاس خالی کر گئی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ہنس دیے۔جیسے کوئی بالکل انوکھا، بڑا ہی پر لطف سا لطیفہ ہو گیا ہو، جو ان دونوں کے سوا کبھی کسی نے نہ سنا ہو۔امتیاز دھکا کھا کر اپنی پڑھنے والی میز پر ڈھیہ گیا۔رانو میز کے کنارے پر جھک آئی۔وہ پورے کا پورا اپنے بالائی ہونٹ پر ابھرے سیاہی مائل غبار میں سمٹ آیا جس میں پسینے کے قطرے لرزاں تھے۔رانو ہنس دی۔یوں کہ کانچ کی نازک پیالیاں ذرا سی باہم چھو جائیں۔

وہ گڑبڑا کر اپنے بستے کو الٹنے پلٹنے لگا۔ پھر ایک زنجیر نکال کر بولا" یہ پہن لو تمہارے لیے لایا ہوں۔""" پہنا دو۔" پھولوں کے بوجھ سے لدی ٹہنی جھک آئی پنکھڑیاں سی بکھر گئیں۔

تب ہائی سکول کے اس طالب علم کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی کانوں کی لویں سرخ ہو گئی تھیں۔اور ناک کی پھنک لرزاں تھی۔

"اے لڑکی......اے رانو کہاں مر گئی ہے۔کم بخت دودھ سارا ابل گیا۔"

وہ باہر بھاگی۔دودھ کے گرنے سے آگ تو بجھ ہی چکی تھی،اوڑھنی کے پلو سے پکڑ کر دیگچہ نیچے اتارا تو آدھا پلو دودھ اور آدھا چولھے میں تھا۔سرعت سے دیگچے کا بیرونی حصہ پلو سے صاف کیا تبھی امتیاز باہر نکلا۔دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں،تو امتیاز کے کانوں کی لویں لال ہو گئیں۔

دسویں جماعت کا یہ ہونہار طالب علم پچھلے کچھ عرصے سے عجیب و غریب احساسات و تجربات سے گزر رہا تھا۔اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ یہ ریت سی قدموں تلے کیوں سرکنے لگی ہے۔

زیبو نے تیتروں کے پیٹ چاک کرتے ہوئے کہا۔

'اے کم بخت یہ تو تجھ سے شرماتا ہے۔"۔

"میں تو نہیں شرماتی نا" وہ زور سے ہنسی۔اتنا زور سے کہ سب لوگ کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

وہ ہرنی کی مانند کلانچیں بھرتی ہوئی اپنی جھگیوں کی جانب بڑھ گئی سقو جونکوں کے بچوں کو اپنی پنڈلیوں سے خون چوسوا رہی تھی اور اس کی چیخیں پورے ماحول پر حاوی تھیں،گندے غلیظ بچے ادھر ادھر رینگتے ہوئے بہتی ناک،،بھنبھناتی مکھیاں ادھ ننگے کیچڑ سے لتھڑے بدبودار جسم، چیسے لگا کر تاش کھیلتے

مردوں کی ٹولیاں۔ سقو کا شوہر اور اس کا باپ چند دوسرے نشے بازوں کے ہمراہ چرس کے سوٹے لگا رہے تھے۔ ایک ٹولی چمٹا بجا بجا کر ناچنے میں مصروف تھی۔ اور کھیتوں میں پسینہ گراتے ہوئے کسان ہر عمل دوسرے سے لاتعلق، ہر شخص دوسرے سے بے نیاز اور سورج سب پر یکساں اپنی کرنیں بکھیرتا ہوا۔

وہ سقو کے پاس رک گئی جس کی پنڈلیوں پر زخم بن چکے تھے۔ اور خون کے قطرے زخموں کے منہ پر یوں ابھرے تھے جیسے موٹے موٹے آنسو ہوں۔ وہ پلو کو منہ میں اُڑسے چیخوں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کرب اور اذیت اس کے روم روم میں جامد ہو گئی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا، یہی جونکیں اس کا روزگار تھیں، اور اپنے روزگار کو وہ اپنے خون سے پال رہی تھی۔ رانو نے سوچا کاش! سقو خوبصورت ہی ہوتی پھر اس کا خون کم از کم جونکیں تو نہ چوستیں، کچھ دیر میں جونکوں کے بچے جو گوشت میں منہ دھنسائے لپڑ لپڑ لہو چوس رہے تھے پھول کر کپا ہو گئے۔ تو ایک ایک کر کے پکے پھل کی مانند ٹپکنے لگے، جونک گرتی تو خون کی ایک دھار بہہ نکلتی۔ جیسے پچکاری سی چھوڑ دی گئی ہو۔ رانو سرعت سے اس کے زخموں میں راکھ بھرنے لگی۔ جب سارے زخم اچھی طرح راکھ سے بھر چکے تو اپنی کٹیا کی جانب بڑھی۔ وہ اپنے خیمے میں داخل ہوئی تو پانچ مربع فٹ خیمے میں بدبو کا بھبوکا اسے پیچھے دھکیل گیا۔ پرال کے بچھے فرش پر چند سیاہ پیندوں والے دیگچے، جھوٹے کٹورے اور روٹیوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ چھت کی درمیانی چوب میں لٹکے بساندزدہ چیتھڑے جن پر دھول کی موٹی تہ چڑھی تھی ایک جانب آگ جلانے والا گڑھا جو راکھ سے بھرا تھا۔ اور اسی راکھ کے گڑھے میں اس کا سات آٹھ مہینے کا بھائی گندگی میں لوٹ رہا تھا۔

اس نے اچٹتی نگاہ سارے پر ڈالی اور واپس پلٹی۔ جب وہ بے سدھ پڑے اپنے باپ کے قریب سے گزری تو اس کی نگاہ کھیت کی منڈیر پر تھی، بے حال سی چلتی ہوئی اپنی ماں پر پڑی جو دن بھر گھگھو گھوڑے بیچنے کے بعد واپس آ رہی تھی اور بچے کی چیخیں اس کے تھکے ماندے قدموں میں قوت پیدا کر رہی تھیں۔

وہ حویلی کے بیرونی دروازے پر پہنچی تو امتیاز جیپ سے اتر رہا تھا۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ امتیاز کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں تو وہ سٹپٹا سا گیا، گھبرا کر ڈرائیور حکیم بخش کی جانب دیکھا جو اپنے مالک کی طرف دیکھ کر ذومعنی انداز سے مسکرا رہا تھا۔ امتیاز جھٹ سے اندر چلا گیا اور رانو کو پیچھے

سے حکیم بخش کی آواز آئی۔

''اری اے......ابھی بچہ ہے...... تیرے جوڑ کا نہیں، کبھی ادھر بھی نظر کرم کر۔ ہم بھی تو...... ۔''

''ہت تھو' ڈھول کی پھانک سی اڑ کر اس کے حلق میں چلی گئی۔

''تو میری طرف دیکھ کر ہنستی کیوں ہے' امتیاز نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔ تو وہ یوں کھلکھلانے لگی۔ جیسے اس کے پہلوؤں میں کوئی گدگدی سی کر رہا ہو۔

''مت ہنسا کرو۔ لوگوں کو شک گزرتا ہے'' ''کیسا شک''۔ وہ امتیاز کے مقابلے میں بڑی سمجھ دار اور زمانہ ساز معلوم ہو رہی تھی۔ اور وہ بہت ہی معصوم اور سہما ہوا بچہ۔

''یہی'' ''کیا'' وہ مچل گئی۔ ''بس یہی''

امتیاز جیسے کچھ اعتراف کرتے ہوئے خود سے شرما رہا ہو۔

پھر اس نے میز پر سے ایک پلیٹ اٹھائی جس میں پھل رکھے تھے اور کہا۔

''لو کھاؤ''

رانو نے ایک سیب اٹھایا اور اس میں دانت گاڑ دیے پھر وہی حصہ امتیاز کے منہ میں ٹھونس دیا۔ تبھی کمرے کے سکوت میں بٹن دبنے کی آواز ابھری اور پورا کمرہ برقی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ بڑی بی بی جی پوری کی پوری ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ رانو کے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ نکل گئی۔ اور وہ باہر بھاگی۔

بی بی جی نے امتیاز کے سر پر ہلکے سے چپت لگائی اور پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ ''گندا بچہ...... نوکرانی کا جھوٹا کھاتا ہے...... بری بات۔''

ان دنوں بہار دھرتی پر بچھ گئی تھی۔ کھیتوں میں مونہا منہ بھر آئی تھی۔ درختوں، پھولوں اور ذرے ذرے میں رچ بس گئی تھی۔

امتیاز امتحان میں مصروف تھا اور یوں کہ اپنے گرد و پیش کو بھی بھول چکا تھا۔ یوں بھی شاید اسے اپنی کتابیں سرسوں کے پھولوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ وہ اسے ڈھونڈتی پھرتی کبھی چنبے کے جھاڑ کے پیچھے، کبھی مصنوعی پہاڑی کے پرے، کبھی پیپل اور نیم کے جھنڈ تلے، اس روز وہ امتیاز کو دیکھنے ڈیرے پر آئی۔ تو جانو نے ہانک لگائی۔

''ارے او میری مورنی!''

ہت تھو...... مٹی کی پھانک سی اس کے منہ میں اڑ کر چلی گئی۔

صفدر نے گھوڑے کی تنومند گردن پر بڑے بڑے تاروں والا برش پھیرتے ہوئے کہا

''لیکن رانو! بات ایک لاکھ روپے کی ایک ہے۔'' ہے تو مورنی ہی۔ پلیلیں ڈالتی مورنی، بن میں ناچتی مورنی، ''مورنی ری مورنی'' وہ گنگنانے لگا۔ ڈرائیور حکیم بخش نے کہا۔ ''نہ بھئی نہ۔ چھوٹے ملک کی منظور نظر ہے۔ اس کا لحاظ کرو۔'' اس پر مشترکہ قہقہہ پڑا۔ پھر اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے بولا۔

''نہ...... نہ یہ ظلم ہے، سراسر ظلم۔ ملک اتمیاز ابھی بچہ ہے...... تو''

تبھی ملک افتخار کی جیپ آ کر رکی۔ سب ملازم مودب کھڑے ہو گئے۔ وہ وہیں رکی رہی۔ افتخار نے سرسری نگاہ ڈالی اور پھر کچھ محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے۔''

''رانو ایک قدم آگے بڑھی اور روتے ہوئے کہا۔''

''ملک جی! یہ سب بدمعاش مجھے تنگ کرتے ہیں۔''

ملک افتخار نے سر گھما کر اسے غور سے دیکھا اور پھر ملازموں کی طرف تیوری چڑھا کر بولا۔

''آئندہ اسے کچھ کہا تو پھڑکا کر رکھ دوں گا۔'' پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ رانو نے گھوم کر سب کو انگوٹھا دکھایا اور تفاخر سے اندر بھاگ گئی۔

یہ دھمکی ملک افتخار کی دھمکی تھی جو سب بدمعاشوں کو خاموش کروانے کو کافی تھی۔

اس دن سے رانو کے دل میں افتخار کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔

وہ ملک افتخار کے سارے کام خود کرنے لگی۔ اس کے کھانے پینے کا پورا دھیان رکھتی اس کے کمرے کی صفائی خود کرتی۔ افتخار کے کمرے کی سج دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ دیوار سے ٹنگا ہرن کا سر ایک طرف رکھا یہ بڑا سا بھاگتا ہوا گھوڑا۔ پہلے تو رانو اسے جیتا جاگتا ہی سمجھی، اور کئی روز اس کے قریب نہیں پھٹکی تھی۔ فرش پر بچھا عنابی قالین جس سے حدت اٹھ اٹھ کر ہر سو آگ سی دہکا رہی تھی۔ دیوار پر سجی خوبصورت لڑکی کی تصویر جس کے لب وا تھے اور چہرے پر عجیب سا کرب پھیلا تھا۔ رانو اسے گھنٹوں ایک ٹک دیکھتی رہتی، اسے محسوس ہوتا جیسے وہ خود اس تصویر کے چوکھٹے میں گھس گئی ہے۔ اس روز بھی وہ اسی پر ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ جب افتخار نے اس سے پوچھا۔

''امتیاز تجھے کیا دیتا ہے۔''

''جی وہ...... وہ گڑ بڑا گئی۔''

''ہاں ہاں...... جو پوچھ رہا ہوں جواب دو۔''

افتخار کا مخصوص تحکمانہ لہجہ تھا۔

''جی وہ پھل فروٹ...... اور...... اور''

''اور وہ دے بھی کیا سکتا ہے بچہ غریب......۔''

پھر یکدم کھڑا ہوا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر قد آدم آئینے کے سامنے لاتے ہوئے بولا۔

''شاید تو نے خود کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔تو اپنی قدر و قیمت نہیں جانتی۔'' سہ رخی آئینے میں جھلکتی اپنی حسین شبیہہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ یہ حسن اتنا سحر خیز تو کبھی نہ تھا۔شاید یہ اس جادوگر کے منتر کی تاثیر تھی جو ابھی ابھی اس پہ پھونکا گیا تھا یا کسی کا سایہ پڑ گیا تھا جو اس شبیہہ کو خوبصورت پس منظر بخش کر خوبصورت ترین بنا رہا تھا اور...... پھر ہرن کا سر اپنی جگہ پر ٹنگا رہا تصویر کے لب کھلے رہے قالین کی حدت اٹھ اٹھ کر ہر سو آگ بھڑکاتی رہی اور وہ اپنے حسن کے ساگر میں ڈوبتی چلی گئی۔ گہری گہری کہیں اتھاہ میں۔

''بستی کے لمبے گھنے درختوں کے پیچھے سورج ایک طشتری کی مانند غروب ہو رہا تھا۔نور سا سارے افق پر بکھرا تھا۔درختوں کے سبز پتے آگ میں دہکتے معلوم ہوتے تھے۔جب وہ اپنی بستی کی طرف آئی اس کے چھوٹے بہن، بھائی بھیک مانگ کر واپس آ چکے تھے اور اب چیلوں کی مانند روٹیوں کے ٹکڑوں پر جھپٹ رہے تھے۔اماں ٹوکرے میں گھگھو گھوڑے ترتیب سے رکھ رہی تھی۔اور پیٹ میں ایک اور غلیظ کیڑے کا بوجھ اٹھائے ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔روٹیوں کے ٹکڑے چھینا جھپٹی میں پرال کے اندر دھنس گئے تھے۔اور بچے پرال میں منہ دھنسائے انہیں چننے کی کوشش کر رہے تھے۔اور ٹکڑوں کے ہمراہ بے شمار تنکے بھی پیٹ کے دوزخ کا ایندھن بن رہے تھے۔جب روٹیاں ختم ہو گئیں تو وہ ایک دوسرے کے منہ کے نوالے چھیننے کے لئے ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگے۔اس کا جی خراب سا ہو گیا اور وہ باہر نکل آئی۔اس کا باپ بڈھے نہال کے پاس بیٹھا چرس کے سوٹے لگا رہا تھا۔وہ قریب سے گزری تو بڈھا بولا۔

''بھائی نکو! یہ چھوری تو مجھے دے دے۔میری دونوں دودھ دیتی اونٹنیاں تیری، میرا نیا خیمہ بھی

تیرا......''

دونوں اونٹنیاں''اس کے باپ کے حلق میں دودھ کی دھاریں سی ٹپکنے لگیں۔اور وہ گھگھیا گیا۔

''اے بڈھے!اونٹوں کے ساتھ ساتھ اگر تو خود بھی بک جائے نا تو بھی میری آس نہ رکھنا۔''

اس نے بڈھے کی کمر میں دو ٹھوڑ جمائے تو وہ لڑکھتا ہوا اونٹوں کی ٹانگوں میں جاپڑا۔اونٹ زور زور سے ڈکرانے لگے۔رانو کے باپ کے منہ میں دودھ کی دھاریں کڑوی سی ہوگئیں۔

یکدم سارا قبیلہ جمع ہوگیا جیسے خطرے کا سائرن بجادیا گیا ہو۔سانول نے اکڑ کر کہا''رانو!تو اسے کچھ نہ کہا کر۔میں کس واسطے ہوں،قسم پیر دستگیر کی آج اس بڈھے کے بچے کو جان سے نہ مارڈالوں تو سانول نام نہیں۔''

بڈھے کے پوتے رانجھن نے تن کر کہا''یہ تو بڈھا ہے میں تو جوان ہوں اور یہ دونوں اونٹ آخر میرے بھی تو ہیں،کیوں چاچا نکو؟''

سبو نے بے ہوش پڑے بوڑھے کی پیٹھ میں کئی ٹانگیں جمائیں اور پھر تحکم سے بولا۔''میں آج کہے دیتا ہوں سارا قبیلہ سن لے اور کان کھول کر سن لے،رانو پر پہلا حق میرا ہے کیونکہ یہ میرے چاچے کی بیٹی ہے۔''

''اوئے!تو نے اشٹام لکھوایا ہے۔میرے ماے کی بیٹی ہے میرا حق ہے اس پر۔''

''آجاؤ پھر میدان میں ابھی فیصلہ کیے لیتے ہیں کہ کون مرد کا بچہ ہے۔''ستو نے مصالحت کی بات کی۔وہ سارے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے۔خانہ بدوشوں کا پورا قبیلہ جمع تھا،نعرے لگاتے،تالیاں بجاتے،فقرے کستے۔اپنے اپنے ہیرو کو ہدایات جاری کرتے اور حوصلہ بڑھاتے۔یکا یک،اس جامد اور بے رس زندگی میں کتنی دلچسپی اور تحرک پیدا ہوگیا تھا۔کچھ دیر وہ دلچسپی سے سارا منظر دیکھتی رہی پھر بے زار ہوکر واپس پلٹی اور بھاگتی ہوئی امتیاز کے کمرے میں گھس گئی۔امتیاز اس روز مزید تعلیم کی غرض سے شہر روانہ ہورہا تھا۔اس نے بہت سی باتیں کیں وعدے لیے،رویا بھی اور رلایا بھی،چلتے سے اس کی چوڑیوں کے ٹوٹے اور بالوں کی لٹیں ساتھ لے گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کیا کرے خود کو مٹاڈالے،مرجائے یا مارڈالے اس وقت وہ ہر ناممکن کو ممکن کرسکتا تھا۔

اسی رات بڑے زور کی آندھی آئی اور خانہ بدوشوں کی بستی میں آگ بھڑک اٹھی۔خیموں کے

کپڑے، چوبیں، رسیاں، پرال سب کچھ تڑ تڑ جل گیا اور اس کا سب سے چھوٹا بھائی بھی اسی آگ میں جل بھن کر راکھ ہو گیا۔ عورتیں، بچے، اونٹ اور کتے چیخ، ڈکرا اور بھونک رہے تھے۔ آسمان ہر شئے کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ دھرتی نہ جانے کیا اگل رہی تھی کیا نگل رہی تھی۔ رانو اور افتخار دونوں نے یہ تباہی اور بربادی کا منظر ایک ساتھ کھڑکی میں سے دیکھا اور رانو نے کہا'' آج تو بستی بالکل ہی اجڑ گئی'' اس نے سوچا کہ وہ جا کر اپنی ماں کو دلاسہ دے اور اپنے قبیلے کی مدد کرے اس نے قدم باہر کی طرف بڑھائے بھی لیکن افتخار نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ ملک افتخار کی باتیں ہوتی ہی بڑے مزے کی تھیں، سب کچھ بُھلا دینے والی۔ وہ گھنٹوں گنگتی رہتی، آسودگیوں اور نا آسودگیوں کی لمبی داستانیں، خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کے دراز سلسلے، جانتے ہوئے انجانے بننے کے خاموش سمجھوتے۔

اگلی صبح جب وہ اپنی بستی میں آئی تو تمام بستی جل کر بھسم ہو چکی تھی، راکھ کے ڈھیروں سے خیموں کے گڑھے بھرے تھے۔ بھیک مانگنے والے کٹورے، اور دیگچے راکھ میں دبے تھے۔ جلی ادھ جلی چوبیں، چیتھڑے اور رسیاں سارے میں بکھرے تھے۔ ستو اپنی جونکوں کو پنڈلیوں سے خون چسوا رہی تھی۔ بندو سانپوں کی پٹاری کھولے انہیں مٹی چٹوا رہا تھا۔

عورتیں گاؤں سے مانگ کر لائے ہوئے رنگ برنگے کپڑوں کو تہ در تہ جوڑ کر نئے خیمے سینے میں مصروف تھیں۔ مرد دہکتی ہوئی آگ کے لمبے لمبے شعلوں پر لکڑیاں سینک سینک کر خیموں کی چوبوں کے واسطے انہیں خمیدہ بنا رہے تھے، ماہر ہاتھوں میں آگ کی تپش پر لکڑیاں غیر محسوس طریقے سے خم دار ہوتی چلی جاتیں، یوں کہ جیسے سانپ آہستہ آہستہ کنڈلی مار رہا ہو۔ شام پڑتے پڑتے اکثر خیمے دوبارہ کھڑے ہو چکے تھے۔ مرد آگ دہکا کر خیموں میں براجمان ہوئے اور عورتیں اور بچے آبادیوں میں بھیک مانگنے نکل گئے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا کبھی کبھی چاند بادلوں کی کوکھ سے ابھرتا تو زمین پر بلند ہوتے شعلوں میں عجیب سا انعکاس پیدا ہوتا جن میں خانہ بدوش جنگلی خرگوشوں کے پیٹ چاک کر کے انہیں سلاخوں میں پرو کر ثابت ہی بھون رہے تھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے تاریکی لمبے لمبے درختوں، کپاس اور کماد کے گہرے سبز کھیتوں اور جلتے ہوئے گوشت کی مہک والے خرگوشوں سمیت سب کچھ ہموار کر دیتی۔

جب افتخار کی شادی کا ہنگامہ شروع ہوا تو رانو کو تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی، زنان خانے کے تمام انتظامات کی ذمے داری اسی کے سر تو تھی۔ بڑی بی بی جی اس پر اعتبار بھی تو بہت کرتی تھیں۔ بار

بار کہتیں دیکھنا کسی مہمان کی قدر و منزلت میں فرق نہ آئے۔ سب کی ضروریات بروقت پوری ہوں۔

امتیاز بھی آیا اور اس کی بے شمار تصویریں بنا ڈالیں، ناچتے ہوئے، گاتے ہوئے، باتیں کرتے، مختلف کاموں میں مصروف جیسے وہ کوئی گم ہوتا ثقافتی ورثہ ہو اور امتیاز اس ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے والا محقق۔ جو اس خزانے کی تمام تر جزئیات اور باقیات کو کیمرے کی آنکھ میں یا کتابوں کے سینے میں یا عجائب خانے کی الماریوں میں دفن کر لینا چاہتا ہو۔

برات کے روز دن بھر جھکڑ چلتے رہے۔ ریت سی چہار سو چکرا رہی تھی۔ جوتا لو سے چپک جاتی تھی۔ رانو کوئی دسویں بار کلی کر چکی تھی۔ لیکن کرکچ سی دانتوں میں بھر گئی تھی۔ دلھن کو حجلۂ عروسی میں پہنچاتے ہوئے بھی وہ منہ چھپا چھپا کر کرکچ تھوکتی رہی اور کرکچ سی نگلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ امتیاز کے کمرے میں جھانک کر دیکھا سارا کمرہ دھول اور ریت کی باریک تہ میں ڈھکا تھا۔ اور وہ خود شہر سے آئے اپنے دوستوں کے ہمراہ ڈیرے میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔ اس نے زبان پورے منہ میں گھما کر اور دانتوں کے اوپر نیچے پھیر کر ساری کرکچ اکٹھی کی اور منہ بھر کر دھول کی دبیز تہ میں تھوکا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ آج بڑے ملک صاحب کے کمرے میں تو کسی نے دودھ ہی نہیں پہنچایا۔

وہ ٹرے اٹھائے بڑے ملک کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے ملک صاحب نے اسے دیکھا تو کئی بار تھا لیکن اس روز جب وہ تپائی پر ٹرے رکھ کر واپس پلٹی تو بڑے عجیب سے انداز سے دیکھا اور پوچھا۔

''افتخار اور امتیاز تجھے کیا دیتے ہیں۔'' ''جی وہ......وہ......''

خیر ڈرتی تو وہ کسی سے نہ تھی۔ لیکن بڑے ملک صاحب کی بات کچھ اور تھی۔ سو وہ دیوار میں گھستی چلی گئی۔ جیسے پار نکل جانا چاہتی ہو۔ ''جو پوچھ رہا ہوں جواب دو۔'' ملک صاحب سرخ انگارہ مخمل کا لحاف چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''جی وہ......پھل فروٹ......اور......اور......''

''اور وہ دے بھی کیا سکتے ہیں غریب لڑکے۔''

ملک صاحب دوزانو فرش نشیں ہو گئے۔ جیسے وقت غروب سورج دھرتی کے کناروں پر گھٹنے ٹیک دے۔ پھر اس کا دہکا ہوا گلاب چہرہ دونوں ہاتھوں کے گول پیالے میں تھامتے ہوئے بولے۔

''رانی! تو واقعی رانی ہے۔ اقلیم حسن کی رانی۔ اس گاؤں کی رانی۔ ملک غلام دستگیر کی مہارانی۔''
ملک صاحب گھٹنے بچھائے یوں بیٹھے تھے۔ جیسے حسن کی دیوی کے حضور پھولوں اور خوشبوؤں کا نذرانہ چڑھا رہے ہوں۔ اور اس حسن کی دیوی کو یوں محسوس ہوا جیسے لاکھوں پجاری نیچے بہت نیچے پاتال میں کھڑے مالائیں جپتے، منتر پڑھتے، دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے اس حسن کی دیوی کو چتا کی آنچ میں نکھار رہے ہیں۔

خراج

عورت قدرت کا حسین تحفہ ہے جسے خدا تعالیٰ نے تزئین کائنات کے لیے روئے زمین پر اتارا۔ لیکن شاید کہ زمانہ اس نوازش بے بہا کا اہل نہ تھا۔ اس انمول عطیہ کی قدر نہ کر سکا۔ کبھی اس پھول کو مسلا گیا، کبھی روندا گیا، کبھی......۔

تالیوں کی آواز سے پورا ہال گونج رہا تھا۔ آمنہ علی کے ایک ایک جملے پر برسنے والی فلک شگاف تالیاں اس بات کی دلیل تھیں کہ وہ سامعین کو پوری طرح اپنے لفظوں کے سحر میں جکڑ چکی ہے۔ آمنہ علی خوب جانتی تھی کہ کون سے حرف اور انداز ادائیگی ساحر کا منتر ثابت ہوں گے اور سامعین کے احساسات و جذبات مکمل طور پر اس کی گرفت میں ہوں گے۔ وہ چاہتی تو ہنسا ڈالتی، چاہتی تو رُلا ڈالتی، چاہتی تو چشم زدن میں انسانوں سے کھچا کھچ بھرے اس ہال کو مبہوت کر ڈالتی لیکن ہر کیفیت کا اختتام تالیوں کی بھرپور بازگشت کی صورت میں ہوتا۔ وہ تقریری مباحثی، فی البدیہہ، اردو، انگریزی، پنجابی جس مقابلے میں، جس کالج میں بھی جاتی اول انعام اس کے ہاتھوں کے لمس کے لیے گویا بے قرار ہوتا اور جھلمل جھلمل کرتی ٹرافیاں اس کے کالج کی الماریوں کی زینت بنتی چلی جاتیں۔

وہ جا رہی ہے آمنہ علی، یہ ہے آمنہ علی، یہ آمنہ علی کون ہے، آمنہ علی کہاں ہے، آمنہ علی......آمنہ علی......۔

جہاں جاتی مرکز نگاہ وہی ہوتی۔ وہ نہ تو کوئی حسین و جمیل تھی نہ ہی گوری چٹی، نہ ہی سرو قد تھی۔ لیکن اتنی پذیرائی، اتنی توجہ، اتنی اہمیت وہ خود پسند تو ہرگز نہ تھی لیکن عرفان ذات ضرور رکھتی تھی۔ طالبات کے لئے وہ آئیڈیل تھی، پروفیسرز میں وہ موضوع گفتگو ہوتی تھی۔ ہرانچارج پروفیسر اپنے شعبے میں اسے تقریری مقابلوں کے لئے منتخب کرنا اعزاز سمجھتی تھی۔ بار بار پروفیسرز کی کالز اس کے لئے آتیں۔ اس کے گھر میں ٹیلی فون موجود نہ تھا۔ ساتھ والے گھر کا چھوٹا بچہ اس کی کال کا پیغام لیے دن میں کئی بار دوڑا چلا آتا اور اسے طوعاً و کرعاً جانا پڑتا۔ جن جن پروفیسرز کے فون اسے آتے تھے اگر کسی اور لڑکی کو وہ کالز آتیں تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ لیکن آمنہ علی کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ لیکن سب سے اہم وجہ وہ لنگور تھا جو ٹیلی فون والے کمرے کی جالی میں آنکھیں دھنسائے اسے مسلسل گھورتا رہتا۔ اگر اس کے کوائف اکٹھے کیے جائیں تو کچھ یوں مرتب پاتے ہیں۔

نام : غفور احمد قد : ٹھگنا

شکل : معمولی کیفیت : ہونق پن اور بدحواسی کا مضحکہ خیز امتزاج

عادات : غیر منظم غیر واضح : پیشہ: سائیکلوں کی مرمت

مشغلہ : آمنہ علی کو آتے جاتے گھورنا اور سرد آہیں بھرنا۔

آمنہ علی گھمنڈی تو ہرگز نہ تھی، لیکن ایک باشعور اور روشن خیال لڑکی کے مناسب حال خیالات و تصورات ضرور رکھتی تھی۔ اور اس کے تخیلات کو کتنی ہی سنگلاخ حقیقتوں اور تلخ ان ہونیوں سے ہی دوچار کیوں نہ ہونا پڑتا۔ آمنہ علی جیسی لڑکی کا معیار کم از کم غفور احمد ہرگز نہ تھا۔

شروع میں تو وہ اسے قطعاً اہمیت ہی نہ دیتی۔ وہ اسے اس بہروپیے کی مانند معلوم ہوتا جس کا مقصد اپنی احمقانہ حرکات سے دوسروں کو محض ہنسانا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کی ہر راہ میں پتھر کی مانند ایستادہ ہونے لگا تو وہ ٹھوکریں مارتے مارتے عاجز آ گئی۔

خدایا کوئی اتنا بھی ڈھیٹ نہ ہو کہ کوئی ضرب بھی ضربِ کاری نہ ہو۔ خدایا کوئی اتنا بھی غبی نہ ہو کہ دوسرے کے ردعمل کو پہچان ہی نہ سکے۔

بجتی ہوئی تالیوں کی گونج میں، بڑے بڑے ہال کمروں کی علمی و ادبی نشستوں میں، کالج کی

دانشورانہ فضاؤں میں وقت اڑتا چلا گیا اور آمنہ علی کا چھوٹا سا گھر چمکتے ہوئے کپوں اور شیلڈز سے مونہا منہ بھر گیا کوئی کونا کھدرا تہی نہ رہا۔ اسناد کے بنڈل گھر کی اکلوتی الماری میں سمائے نہ سماتے تھے۔ بی۔اے، ایم۔اے کی ڈگریاں بھی اچھی پوزیشن کی نشاندہی کرتی تھیں۔ ہر ہر مرحلے پر قدم چومتی ہوئی کامیابی و کامرانی نے اُسے بلا کا اعتماد بخش دیا تھا۔ روشن مستقبل کی خوش آئند تصویریں ہر سو رقصاں تھیں۔

اور جب وہ فسٹ کلاس ایم۔اے کی ڈگری اور بے شمار اسناد کا بوجھ تھامے اپنے پہلے انٹرویو پینل کے سامنے پیش ہوئی تو بڑے ہال کمروں کی فضاؤں میں پٹتی تالیوں اور ستائشی جملوں کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ ایسے تھی جیسے وہ تالیوں کی تھاپ پر اول انعام وصول کرنے سٹیج کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہو۔

اور واقعی اس کا انٹرویو اس کی تقریروں کی مانند نہایت شاندار رہا۔ اول انعام کی تو وہ سدا سے عادی رہی تھی۔ دوم انعام کا تصور کبھی ذہن سے گزرا ہی نہ تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کب سب سے پہلی کال اسے ملے گی اور وہ اپنے پسندیدہ کالج کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے مستفید کرے گی۔ جہاں کی فضاؤں میں اس کا نام ابھی بھی کامیابی و کامرانی کی علامت بن کر گونج رہا تھا۔

لیکن یہ حقیقت تھی۔ بڑی ہی کریہہ اور قبیح حقیقت کہ اس کی سلیکشن نہ ہو سکی۔

اس نے سوچا کہ شاید ججمنٹ میں کہیں جانبداری ہوگئی۔ کہیں لفظوں کے منتر اپنی تاثیر کھو گئے۔ اگلا انٹرویو اس نے پہلے سے بھی زیادہ محنت سے دیا لیکن نتیجہ پہلے سے مختلف نہ رہا اور پھر انٹرویو دینا اور ناکام ہونا گویا زندگی کا معمول بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ آمنہ علی کو یقین ہو گیا کہ کامیابی اس کے مقدر میں رقم ہی نہیں کی گئی۔ وہ جب بھی انٹرویو کے لئے گھر سے نکلتی غفور احمد ہاتھ میں سرخ گلاب پکڑے گندے نالے سے لگا سامنے کھڑا ہوتا اور جونہی وہ اپنے گھر کے پاس سے گزرنے والے نالے کو عبور کرنے لگتی تو یہ سرخ گلاب اس کے قدموں کو چومتے ہوئے زمین بوس ہو جاتے۔ جنہیں وہ ٹھوکر مار کر نالے کی بے انتہا آلائشوں کے سپرد کر دیتی۔ ان گنت معطر گلابوں کی خوشبو بھی نالے کے تعفن کو کبھی ختم نہ کر سکی۔ لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ گندے نالے کے کھلے دہانوں کا لقمہ بننے والے ان معطر تر و تازہ گلابوں کا آخر کیا گناہ ہے، جب ذلت و عزت ایک ہی ہاتھ میں ہے تو پھر کھلونے ٹوٹنے کے لیے کیوں بنتے ہیں شاید کردہ گناہ کی سزا کسی ناکردہ گناہ کی صورت میں ملتی ہے۔

جس طرح کالی بلی رستہ کاٹ کر وہم میں مبتلا کر جاتی ہے اسی طرح آمنہ علی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ کالا بلا اس کے مستقبل کی سب سے بڑی نحوست ہے جس طرح آمنہ علی اپنے گھر کے پاس سے گزرنے والے گندے نالے کو انتہائی ناگواری اور شدید ناپسندیدگی کا احساس لیے آتے جاتے روز عبور کرتی تھی۔ بالکل اسی طرح گندے نالے کے کنارے سے لگے کھڑے غفور احمد کے پاس سے بھی انتہائی ناگواری اور شدید ناپسندیدگی کا احساس لیے روز گزر جاتی تھی لیکن جس طرح اپنی تمام تر نفرتوں اور کریہتوں کے باوجود وہ اس گندے نالے کو اپنی جگہ سے کبھی نہ ہٹا سکی اسی طرح وہ غفور احمد کو بھی اس کی احمقانہ حرکات سے کبھی نہ روک سکی۔

وقت کے طول پکڑتے سائے، تصورات و معیارات کی بندشوں کی گرہیں ڈھیلی کر ڈالتے ہیں ضروری نہیں کہ انسان جو چاہے وہ حاصل بھی کر سکے اور جو نہ چاہے اس سے گریزاں ہی رہے۔ شاید سمجھوتے اسی کیفیت کا نام ہیں اور زندگی گزارنے کے لیے ناگزیر ہیں۔

آمنہ علی نے جب مقامی ہائی سکول میں بطور ایس، ایس، ٹی کے ملازمت اختیار کی اس روز اس کی امی تادیر اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ جیسے وہ کوئی اہم بات کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہنے کی ہمت نہ پا رہی ہوں۔ مختلف وقفوں میں مختلف تمہیدیں باندھتی رہیں۔ بالآخر لفظوں کو چن چن کر گویا ہوئیں۔

''خوشی کی بات ہے کہ تمہاری ملازمت لگی۔ تمہارے معیار کے مطابق نہ سہی لیکن معیار تو بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو انسان سر پھرا تو اپنی کامیابیوں میں بدمست خدا کی شناخت ہی بھول جائے۔ چاہتی تو میں یہ تھی کہ تمہاری شادی ہو جاتی اور لڑکی کو روبوٹ بننے والے مراحل سے تمہیں نہ گزرنا پڑتا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے معیار کا کوئی رشتہ آیا ہی نہیں۔ جب ناک پر رومال رکھ کے پائنچے اٹھا کر گلی میں گھسنا پڑے، بیٹھک کی بوسیدہ کرسیوں پر آرام کی بجائے تکلیف محسوس ہو دو فٹ کے ٹائیلٹ میں گھستے ہوئے امیر زادیوں کا دم گھٹنے لگے تو اس گھر میں اچھے رشتے نہیں آیا کرتے گندے نالے میں گرے گلابوں کو کون اٹھاتا ہے۔''

وہ حیرت سے اپنی ماں کی طرف تک رہی تھی۔ قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم رکھنے والی یہ گرہستن ایسی فلسفیانہ باتیں کیسے کر سکتی ہے۔ شاید تجربات ہی فلسفوں کے ماٰخذ ہوتے ہیں کچھ دیر دونوں ماں، بیٹی لفظوں کی سنگینی پر ایمان پختہ کرتی رہیں پھر وہ اپنی حیرت کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

''اماں کیا خوبصورت تقریر کی ہے۔ خدا کی قسم مزا آ گیا۔ اور معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کیوں نہ ہو آخر کو پنجاب کی بہترین ڈیبیٹر کی ماں جو ٹھہریں۔''

لیکن میری تقریر کا اختتامی حصہ ابھی باقی ہے۔ ماں نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

''سامع ہمہ تن گوش ہے، جہاں سے سلسلہ تقریر ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑا جائے۔''

''آمنہ گندے نالے کے کھلے دہانوں کا لقمہ بننے والے معطر گلاب تجھ سے خراج طلب کرتے ہیں۔ غفور احمد اچھا لڑکا ہے، کوئی عیب بھی نہیں کمائی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمھیں پسند بھی کرتا ہے، اس کے گھر والے خواہش مند بھی ہیں۔ اگر تم...... اگر تم......''

اماں نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا جیسے سانس لینے کو رکیں تو کبھی بات مکمل نہ کر پائیں گی۔

آمنہ علی کو لگا لفظ نوکیلی سوئیوں کی مانند اس کی نس نس میں پور پور میں چبھ گئے ہیں۔

وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ''جس طرح میں اپنے رستے سے تمام تر نفرتوں اور حقارتوں کے باوجود اس گندے نالے کو نہیں ہٹا سکی شاید اسی طرح......''

اماں نے اس کا سر کندھے سے لگا لیا اور تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''محبت میں اس سے کڑا کوئی دوسرا امتحان نہیں ہوتا کہ قبولیت کو نا قبولیت کا کرب سہنا پڑے۔ وہ سرخرو ہوا ہے...... آمنہ! سرخرو......'' توقف کا ایک طویل اور اذیت دہ لمحہ ماں بیٹی کے درمیان حائل ہو گیا آتش آگہی کی حدت جان لیوا تھی کہ کوئی چیخنا بھی چاہے تو حلق میں بھرا دھواں اور آگ صدا کو نگل لیں آمنہ نے بے بسی سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پوری کی پوری ماں کی کھلی آنکھوں میں گھستی چلی گئی اور ماں نے پلکوں کا گہرا گہرا سایہ بچھا دیا۔

پس منظر

اگرچہ اس کا فراد احسینہ روزگار کے عاشقوں کی فہرست بہت طویل تھی۔ قدم، قدم اک ہنگامہ، بام، بام از دحام، کوئی ڈول رہا تھا۔ کوئی بہک رہا تھا۔ کوئی گر اپڑا تھا۔ منظر ہو بہو لکھنوی شعرا کے ماجرۂ حسن وعشق کا سا تھا۔

میرے عم حضور اور ان کے تمام صاحبزادوں سے لے کر گاؤں کے موچی، نائی، تیلی سبھی اسے دیکھ کر آہیں بھرتے اور منہ میں آئی رال ہونٹوں اور مونچھوں پر ٹپکاتے اور چاٹتے رہتے۔

خود مجھے آج تک یہ علم نہ ہو سکا کہ میں اس کے عاشقوں میں شامل ہوں یا کہ نہیں۔ یا کس درجے کے عاشقوں میں میرا نام نامی رقم ہوگا۔ کیونکہ اس آفت جاں کے عاشقوں کے درجات بھی کئی منازل میں منقسم تھے۔ ان میں رموں مصلی کا سولہ سالہ بیٹا بھی شامل تھا۔ جس کی جان اس نازنین کی بے التفاتی نے لے لی، اور وہ زہر کا پیالہ پی کر عاشقوں کی فہرست میں سرفہرست آ گیا۔ اور میرے عم حضور اور عم زاد بھی تھے جو اس مہ جبیں کو سر کرنا ہی عشق کی معراج سمجھتے تھے اور اکثر گنگناتے رہتے تھے۔

اس حسن کے موتی کو ہم دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں
وہ دولت کیا وہ خزانہ کیا !

ہاں تو اپنے بارے میں، میں کچھ درست سا فیصلہ نہیں کر پایا کہ عاشقوں کی اس مارتھن ریس

میں، میں کس مقام پر ہوں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں جز وقتی عاشق ہوں۔اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ جب میں شہر چلا جاتا ہوں تو کالج کی مصروفیت اور شہر کی ہنگامہ خیزیوں میں کھو کر اس حسن بے پناہ سے غافل ہو جاتا ہوں اور جب دوران تعطیلات گاؤں واپس آتا ہوں تو وہ ظالم اس بری طرح میرے حواس پر چھا جاتی ہے کہ اسے دیکھے بنا تڑپنے لگتا ہوں اور اسے دیکھ کر دم نکلتا ہے۔تب میں دیوان میر اور مثنویٔ شوق کی سی کتابیں تکیے کے نیچے رکھ کر سونے لگتا ہوں، سوتا کہاں ہوں خواب بنتا رہتا ہوں ہجر و وصل کے فلسفے پر غور کرتا ہوں اور نا آسودہ خواہشات سے عاجز آ کر روتا رہتا ہوں۔اس وقت مجھے اپنے عم زادوں سے شدید قسم کی نفرت اور رقابت محسوس ہوتی ہے۔ جنہیں اس حسینہ عالم کا دیدار عام حاصل ہے کیونکہ وہ ان کے مزارعے کی بیٹی ہے اور اپنے گھر سے زیادہ ان کے گھر میں پائی جاتی ہے، تب میں انتقام سے بھرپور فلمیں دیکھتا ہوں اور قتل وغیرہ کی کم سے کم سزاؤں کے بارے میں استفسار کرتا رہتا ہوں۔

لیکن اس روز میری زندگی میں عجب سانحہ سا گزر گیا۔وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ مجھے خود سے وحشت سی محسوس ہونے لگی۔ میں خواب میں، خیال میں تو اسے خود سے بھی زیادہ قریب محسوس کرتا تھا۔اس کی قربت کے تصور سے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ میں نے کئی کئی راتیں اس کے فراق میں رو رو کر گزاری تھیں، لیکن یہ حقیقت کہ اس کا سر کرنا انسانی دسترس میں ہے۔اس گوہر نایاب کی عظمت کے منافی تھا۔اس عجیب سے فلسفے سے آگاہی مجھے اس وقت ہوئی۔ جب وہ میرا منہ چڑاتی ہوئی میرے عم زاد کے گھر بھاگ گئی اور میں نے لڑائی کے بعد یاد آنے والے ایک نہیں بلکہ دو مکے اپنے منہ پر مارے۔میری اس ہیت کذائی پر میرے ایک ذاتی ملازم کا قہقہہ جانے کہاں سے لڑھکا اور لفظ سماعت کو چھید گئے۔

''لڑکی بڑی پٹاخہ ہے لیکن ہرایرے غیرے کے ہاتھوں چھٹنے والا۔''

اس روز جب وہ مجھے دوبارہ نظر پڑی تو اس نے منہ بھی چڑایا اور فضا میں انگوٹھا لہرا کر بھاگ گئی تھی۔اگر چہ اس وقت وہ اپلوں اور گوبر سے بھرے متعفن پس منظر میں کھڑی تھی لیکن مجھے پھر بھی اچھی لگی اور میں ایک بار پھر اس پر جی جان سے مر مٹا۔اس کی ان عامیانہ حرکات کے لیے میرے دماغ نے پھر دفاع سوچا۔جن حالات و پس منظر میں وہ پروان چڑھی ہے۔اس قسم کا ردعمل کوئی غیر فطری عمل نہیں

ہے۔ کہتے ہیں غریب کی جورو سب کی بھابی اور غریب کی بیٹی اور وہ بھی حسین و جمیل بیٹی۔ اس صورت حال پر بھی کوئی مثل یا کہاوت وغیرہ ہونی چاہیے۔ اہل زبان کو ذرا غور کرنا چاہیے۔ اور میں نے اس وقت بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا کہ میں اسے اپنا سا بنالوں۔ بھیڑیوں اور گدھوں کے اس معاشرے سے کہیں دور لے جاؤں اور میں اپنے اس فلاحی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بالکل قریب تھا کہ برا ہو، اس کالج کا کہ ایک بار پھر کھل گیا اور مجھے بادلِ ناخواستہ شہر آنا پڑا۔ اور پھر وہی ہوا جو اکثر میرے ساتھ ہوتا چلا آیا تھا۔ دل و دماغ پر بلائینڈ کرٹن سا آ گیا۔ جس نے پچھلے سارے چہرے اور واقعات دھندلا دیے۔

انہی دنوں مہ وش نے کچھ اس طرح میرے حواس کا احاطہ کیا کہ میں تو بے بس سا ہو گیا۔ در اصل وہ شہر کی ایک انتہائی ہوشیار اور فیشن ایبل لڑکی تھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر میرا انتخاب کیا۔ ہر ہر پہلو سے میرا تجزیہ کیا اور جان لیا کہ مد مقابل کس کس معاملے میں کمزور ہے اور کس طرز کا حملہ اسے پسپا کر دینے پر مجبور کر دے گا۔ اور پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر اور گڑگڑا کر کہا:

''مہ وش! مجھ سے شادی کر لو ورنہ......'' اور ورنہ کے بعد کے خطرناک نتائج کا خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔

شادی کی تمام رسومات کے دوران میں نے اس حسن مجسم کو پیش پیش پایا۔ مہینہ بھر گائے جانے والے گیتوں میں اس کی مدھر آواز سب پر غالب تھی۔ مایوں کی رسم میں میرے چہرے پر ابٹن اسی نے تھوپ دیا تھا اور خود بھاگ گئی تھی اور سارے مجمع میں مٹھائی تقسیم کرتی پھر رہی تھی۔ ہر ہر منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی اسے ضرور پکارتا نازو...... نازو...... جیسے پورا انتظام نازو کے دم قدم سے ہی چل رہا ہو۔ اور مجھے شاید پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام نازو ہے۔ اس کے لیے کبھی کسی نام کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شاید یہی اس کی حیات کا ماحصل تھا۔ وہ ہر آنکھ کے لیے ایک الگ نام رکھتی تھی۔ وہ ہمہ گیر تھی مخصوص نہیں جیسے آسمانوں سے اترتی دودھیا چاندنی جیسے تاروں کی چھاؤں، ساون کی رم جھم۔ تب مجھے اچانک خیال آیا ''ارے یہ بھی تو تھی! قلب و نظر کا پہلا جذباتی لمس۔

میرا ذہن تھوڑا منطقی سا واقع ہوا ہے، مطمئن ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل کوئی جواز کوئی منطق بڑی ضروری ہو جاتی ہے سو میں نے سوچا چیزیں اپنے مخصوص پس منظر کے ہمراہ ہی اپنی افادیت

اور اہمیت باور کراتی ہیں۔ شاید نازو کو اس کے مخصوص پس منظر سے الگ کر دیا جائے تو وہ نازو نہ رہے شاید موجودہ نازو سے بہت زیادہ خوبصورت یا بہت زیادہ بدصورت نازو اور بدصورتی! یہ سوچنا سوئے ادب ہے توہین حسن ہے۔

شادی کے بعد کبھی کبھار گاؤں آنا ہوتا تو نازو کا تذکرہ بھی سننے کو ضرور مل جاتا۔ نازو کی شادی ہو گئی۔ نازو نے بڈھے شوہر سے طلاق لے لی، نازو اپاہج شوہر کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اور مجھے ہمیشہ لگا یہ تبدیل ہوتے مناظر حالات و پس منظر کے عین مطابق ہیں۔ نازو کی زندگی کسی جمود یا کسی قسم کی تنظیم کا شکار ہو ہی نہیں سکتی وہ اک پٹاخہ ہے اور نئے نئے دھماکے ہوتے رہنا ہی اس کے وجود کی دلیل ہے۔

غالباً دس برس بعد ایک بار گاؤں آنا ہوا۔ تو نازو سے متعلق ایک اور خبر منتظر تھی۔ نازو شدید بیمار ہے! کیوں! کب سے! میں نے اس شدت سے تڑپ کر پوچھا کہ مہ وش نے مجھے چونک کر دیکھا ''یہ آپ کی بے تابی بڑی ہی معنی خیز ہے۔ کیوں! کب سے! میں بڑا صالح قسم کا شوہر واقع ہوا ہوں، میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے تسلی دی کہ ایسی ویسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے۔ دل کے بند دریچوں سے ٹکرانے والے بے بضاعت جھونکے کبھی کواڑ نہیں توڑا کرتے۔ تبھی غالباً میری بہن نے کہا'' نازو آ رہی ہے۔''

میں جو یقین دہانی کروا رہا تھا یکبارگی بھول گیا۔

''کہاں ہے۔'' میں نے غالباً نہیں بلکہ یقیناً شادی کے بعد اسے پہلی بار دیکھنا تھا'' کہاں'' میں نے پھر بے صبری سے پوچھا۔

''وہ......وہ'' کسی نے انگلی سے نشاندہی کی۔

''وہ'' تپ دق کی مریضہ زندگی کی آخری سانسیں گنتی ہوئی بڑھیا جو رینگتی چلی آ رہی تھی۔ کیا وہ نازو تھی؟۔

نازو۔ جس میں قدرت نے حسن و دلکشی کے سارے ہی رنگ حیرت انگیز حد تک متناسب کر دیے تھے۔

اس مشت استخواں نے فرداً فرداً سب کے سروں پر دست شفقت رکھا۔ جن میں، میں بھی شامل

تھا سبھی نے منہ ناک ڈھانپ لیے۔ بڑی بھابی سے رہا نہیں گیا تو انہوں نے کہا" بیٹھ جاؤ نازو پرے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ جو کہنا ہے وہیں بیٹھ کر کہہ دو۔" کہنا کیا ہے کچھ مانگنے آئی ہو گی" چھوٹی بھابی نے ناک بھوں چڑھائی وہ برآمدے کی نچلی سیڑھی پر بیٹھ کرٹی ، بی کی مخصوص کھانسی کھانسنے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔ اس کے گال جنہیں جدید شاعری میں گلاب عارض کہا گیا سوکھے چمڑے کی مانند جبڑوں میں دھنسے تھے۔ اس کی خوبصورت ناک جسے میں قلوپطرہ کی ناک کہا کرتا تھا اس کے متعفن نتھنوں میں دو مکھیاں گھسی چلی جارہی تھیں۔ آنکھوں کے تاریک گڑھوں میں پیوست بڑے بڑے ڈیلے حیرت انگیز حد تک کھلے تھے۔ یہ وہی آنکھیں تھیں، جنہیں میں موزوں استعارہ نہ سوجھنے کی بنا پر نرگس کی آنکھ کہا کرتا تھا۔

"سب کہتے ہیں بھینس بیچ کر اپنے علاج پر لگا دو لیکن میں مر جاؤں گی بھینس نہیں بیچوں گی۔" ٹی ، بی کی آخری سٹیج والی یہ مریضہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ نہ جانے اس وقت وہ ہجوم عاشقاں کہاں تھا جو بات بے بات لہو کے پیالے بھر بھر کر نچھاور کرتا تھا۔ اور وہ جو اس رنگین برسات میں بری طرح بھیگ جاتی تھی نہ جانے کس خونی ریلے میں بہہ گئی تھی۔

"کچھ کھاؤ گی" پتہ نہیں کس نے اس سے اظہار ہمدردی کیا۔

"ہاں...... ہاں...... دل اور کلیجی" اسے منہ بھر کر کھانسی آگئی اور میلا کچیلا پلو لال ہو گیا۔

"اچھا اب جاؤ ہم بھجوا دیں گے۔" کسی نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

وہ کب گئی تھی کس طرح گئی تھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر آف ہو چکا تھا۔ اور جسم کے تمام اعضا بے کار۔ اتنے بڑے سانحے کے بعد اگر میرے سانس کی آمد و رفت جاری تھی تو یہ بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میرا اس سے کوئی قلبی تعلق نہ سہی ، وہ میری نوعمری کے رومانوی اور وجدانی عہد کا حسین ماضی تو تھی۔ وہ گاؤں کی جمالی اور رومانی زندگی کا سب سے بڑا محرک تھی۔ رنگ بکھیرتی ، خوشبوئیں لنڈھاتی قہقہے اڑاتی۔ اس کے رنگوں ، خوشبوؤں اور قہقہوں کے مستفیدگان نہ جانے کہاں گم تھے پر میں تو اس کا مجرم کسی طرح بھی نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میرا ذہن تھوڑا منطقی سا واقع ہوا ہے۔ میرا ضمیر کسی منطق کسی دلیل سے مطمئن ہونا چاہتا تھا اور میں نے سوچا۔ نازو کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص پس

منظر اور حالات کے ہمراہ اپنے منطقی انجام کی جانب سرعت سے بھاگ رہی تھی۔اس طرح کے جنگلی پھولوں کا انجام قدرت نے ایسا ہی لکھا ہے، کھلنا دو روز جی بھر کے خوشبو لنڈھانا، ساری جمع پونجی آن واحد میں ہی تمام کر ڈالنا اور بکھر جانا۔

سڈن ڈیتھ

اساڑھ کی تپتی لو میں پھوارسی برسنے لگے۔لق ودق ریگزار میں بھٹکے مسافر کو اُمڈتے چشمے سیراب کردیں، جاں بلب آبِ حیات پی کر بھلا چنگا ہو جائے۔

یہ قصہ بھی ایسے ہی ناممکنات کا ایک سلسلہ ہے کہ جس دل نے کبھی تمنا کا نام بھی لیا، تو پشیمان ہو کر اطراف میں نگاہ ڈالی کہ جرم خیال پر کوئی نگاہ پہرے دار تو نہیں۔آج اس جرم خیال نے حسنِ خیال کے تمام تر پیرایہ اظہار کی تمام تر رعنائیوں کو سمو کر سب کچھ طشت از بام کر دیا تھا۔اور پوشیدگی کا سارا بھید، سارا اچنبھا، سارا اسرار سماعتوں اور بصارتوں کو منجمد کر گیا تھا۔

بڑی ہی غیراہم سی لڑکی، بڑی ہی غیر محسوس سی، جس کا وجود اس کی موجودیت کا قطعی جواز نہ تھا۔

وہ آئی رکی، اور چلی گئی کیوں، کب اور کہاں۔کسی کو جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

''جس کی ویل چیئر کی گڑ گڑاہٹ، فطری اورازلی رحم دلانہ جذبات سے بندھی تھی۔

''چچ چچ بے چاری، غریب''، افسوسناک صدائیں، کرخت اور بھدی گڑگڑاہٹ میں لپٹ جاتیں۔آج یہی کھڑ کھڑاہٹ مدھر موسیقی کے سروں میں ڈھل گئی تھی اور ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں اقامت پذیر تمام استانیاں اس موسیقی کو دانتوں میں انگلی داب اور دلوں پر ہاتھ رکھ کر سنتی تھیں اور دہل دہل جاتی تھیں۔

''ڈاکٹر عامر واقعی ہینڈسم ہے۔'' تبصروں کی تمہید بندھتی۔ ثمینہ اپنے اردگرد بیٹھی بونی بونی سی استانیوں پر رحم دلانہ نگاہیں ڈالتی، یہ سب لڑکیاں خالی خالی کھوکھلے گھونگوں سی، جن کی سیپیاں گم تھیں۔ اور جو قطرہ نیساں کے انتظار میں سوکھ کر کرنڈ ہو رہی تھیں۔ جو دوسرے جزیروں پہ برستی بارشوں کو حریص تشنہ نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔

''میرے تمام کزنز میں سے زیادہ ہینڈسم لڑکا ہے۔'' تفاخر لفظوں میں ڈھل جاتا۔ سارے بہار موسم بدن کے شجر پر برس جاتے۔ برگ گل وجود کا پیراہن ہو جاتے۔

''تو اسے تم ہی ملی تھیں معمولی شکل وصورت کی اپاہج عورت۔''

دلوں میں پھیلے تاریک سناٹے میں تیز ہیجانی چیخ کی مانند یہ لفظ پھیل جاتے۔ بازگشت ساعتوں کو پتھرا دیتی۔ حیرت، نفرت اور رقابت کا غازہ چہروں پر دبیز ہو جاتا۔ پیچیدہ جالوں کی طرح جس میں بے بس جگنو تڑپتے رہ جاتے۔ لڑکیاں ہونکنے لگتیں لیکن اسے یہ سب دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ اس کی آنکھیں ست رنگے موتیوں کے چورے سے لبریز تھیں جو بھائی دیتا وہ قوس وقزح کے رنگوں میں لپٹا ہوتا۔ ساعتوں میں لہجے کی مٹھاس امرت بن کر رچ بس گئی تھی۔ جو سنائی دیتا قند کی چاشنی میں گھلا ہوتا۔ عجب حادثہ تھا کہ ہر شئے، ہر ذی روح اپنی جون تبدیل کر گئی تھی۔ جیسے چٹکی بجانے میں مکھی انسان کا روپ دھار لے۔ شاید یہ مرحلہ تکمیل تھا۔ ناتمامیت کے منتشر ہاتھوں میں جکڑی کائنات ادھوری، بے رس اور بدنما تھی۔ تمامیت نے اسے مکمل، بھرپور اور خوش نما بنا دیا تھا، خوفناک اور ناقابل فہم کرب ذات کا عقدہ کھل گیا تھا۔

لال رنگ کی موٹر بائیک کا ہارن نہیں خطرے کا سائرن تھا۔ خوش آہنگ آواز کے ساتھ، جذبات واحساسات، فکر وعمل کا پورا انظام فعال ہو جاتا۔ جیسے ریموٹ کنٹرول گاڑیوں کا بٹن آن کر دیا جائے۔ اور وہ گھومتی چلی جائیں، اپنی مخصوص چال میں اپنے مخصوص کرتب کے ہمراہ، اپنے محور کے گرد، جب تک کہ ریموٹ کنٹرول والا ہاتھ بٹن آف نہ کر دے ڈاکٹر عامر آ گیا، ثمینہ کی ویل چیئر کو سہارا دینے کو کئی رضا کار موجود تھیں، ہاتھ نہیں بھی پڑتا تو بھی ڈالا جاتا۔ یہ غیر اہم سی لڑکی، بڑی ہی معمولی سی، جس کا کبھی کوئی حاسد نہ ہوا تھا، حسد کرنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ کتنی بڑی کمی، کتنی بڑی محرومی آج اس کے حاسدوں کی کوئی حد، کوئی شمار نہ تھا، اور وہ کتنا اہم تھا جس نے غیر اہم کو اہم بنا دیا تھا۔ خود اپنی ہی نگاہوں

میں محترم بنا دیا تھا۔ مکھی سے انسان بننے تک کے مدارج میں کتنا بعد کتنی کڑی مسافتیں، کتنی جاں لیوا ریاضتیں حائل تھیں، سب کچھ جادوئی منتر سے سر ہو گیا۔ اور "کیسے" کا حیرت زدہ صدمہ لڑکیوں کو سکتے سے دوچار کر گیا۔

حبس موسم جب حد سے گزر جاتے ہیں تو جھکڑ چلتے ہیں، سیاہ و سرخ بگولے، کنکر پتھر تنکے لپیٹے گول گول چکروں میں گھومنے لگتے۔ جیسے مرشد کی چوکھٹ پر دیوانہ وار دھمال ڈال رہے ہوں۔ آندھیوں کی شوں شکار دھول آلود فضا میں چنگھارسی بن کر گونج جاتی، بازگشت بار بار لوٹتی۔ "محض دل لگی کر رہا ہے، فلرٹ کرتا ہے، وقت گزاری کرنے آتا ہے۔ نہیں کسی اور کی ٹوہ میں آتا ہے۔"

کتنے دل دھڑک کر بند ہو جاتے شاید...... شاید...... اور شاید کے اندر تو پوری داستان امید و یاس پوشیدہ ہے تمام تر سنسنی، ہیجان اور یاس و امید کی ساری سنگینیاں احاطہ کر جاتیں۔

"محبت کرتا ہے۔ ثمینہ سے۔ محبت کسی بھی ظاہری نفع و نقصان سے بالاتر ہوتی ہے۔"

ایسے تصادم اور کشمکش میں خیر کے نمائندے کا جنم ناگزیر ہوتا ہے اور یہ قرعہ فال ناہید کے نام نکلتا۔

"خدا بڑا رحیم ہے موسموں کے شدائد ناقابل برداشت ہو جائیں تو موسم بدل جاتے ہیں۔ جب درد جان لیوا ہو جائے تو مسیحا جنم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر عامر مسیحا ہے"، خیر کا نمائندہ اپنا فیصلہ سنا دیتا۔ لڑکیوں کے سینے میں سوتیا ڈاہ ناسور کی گانٹھ بن جاتی۔ درد روم روم سے پھوٹ نکلتا۔

ڈاکٹر عامر کی بائیک کے ہارن سے ناہید کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ساری دوپہر سوتی رہی تھی اور پسینے سے بری طرح بھیگ رہی تھی مہین سفید کرتا بدن پر چپک کر مسک گیا تھا۔ جیسے دودھیا چاندنی، چلمنوں کی جالیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو، وہ بھاگتی ہوئی گئی اور کہا "ثمینہ تو بازار گئی ہے۔ دو گھنٹے ٹھہر کے آ جایئے گا۔" کاش ثمینہ نہ جاتی۔ کتنی بڑی خوشی سے محروم رہ گئی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ بیساکھیوں کی سولی پر لٹکی انتظار کی صلیب پر عمر بتا دیتی ذرا جنبش بھی نہ کرتی کہ کہیں کانچ سا نازک سپنا بکھر نہ جائے۔ شاید وہ ڈاکٹر عامر کے لیے کوئی تحفہ لینے گئی تھی لیکن تاخیر ہو گئی۔

"تو کیا آپ دو گھنٹے میرے ساتھ نہیں گزار سکتیں۔" اسے یقین تو نہ آیا۔

یقین کرنے کو کوئی جواز بھی تو موجود نہ تھا۔ آج تک کے ظاہری حالات ایسی کوئی بنیاد بھی فراہم

نہ کرتے تھے۔لیکن یہ الفاظ...... غالباً نہیں یقیناً ڈاکٹر عامر کے منہ سے ہی نکلے تھے۔

یہ بت بڑے ہی برے طریقے سے ٹوٹا تھا۔ جیسے مسجد کا مینار تیز جھکڑوں کی زد میں آ کر پاش پاش ہو جائے......اور چھوٹے بڑے بے شمار ٹکڑے منہ کے بل آدھے آدھے بھربھری زمین میں دھنس جائیں، آخر کو وہی مردوں کی مخصوص ذہنیت، نہ جانے کس معاشرتی تبدیلی، کس سماجی ارتقاء، کس فکری انقلاب کی منتظر ہے یہ دنیا۔ کہ جو موجود نہیں ہونا چاہیے وہ غیر موجود ہو جائے اور جو موجود ہونا چاہیے وہ موجود ہو جائے۔اور غیر موجود کے موجود ہونے اور موجود کے غیر موجود ہونے میں نہ جانے ابھی کتنے زمانوں کے بعد حائل ہیں تو کیا اس وقت تک یہ سب کچھ جو خام، زہرناک اور ہلاکت خیز ہے اپنی فولادی مٹھیاں یونہی کھولتا اور بھینچتا رہے گا۔''تم مجھ سے شادی کرو گی'' اسے پھر اپنی سماعت پر شک گزرا۔شک نہ گزرنے کا کوئی جواز بھی نہ تھا۔لیکن یہ لفظ بھی غالباً نہیں یقیناً ڈاکٹر عامر کے منہ سے ہی نکلے تھے۔ وہ حادثاتی طور پر خیر کی نمائندہ بن چکی تھی۔اور اب اس کے سامنے شر کا نمائندہ آن کھڑا ہوا تھا۔یہ جنگ ازل سے جاری تھی اور ابد تک جاری رہنا تھی اور اس وقت وہ اس جنگ میں بری طرح دھکیل دی گئی تھی۔

''تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے یہ لفظ کسی اور سے بھی کہے ہوں گے تو تمہاری یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ میں نے آج تک ثمینہ سے کسی قسم کے جذباتی تعلق کا اظہار نہیں کیا میں محض اس کا ڈاکٹر ہوں۔''

بے حس اور لاتعلق ڈاکٹر نا کام آپریشن کی خبر مردہ بچے کی ماں کو سنا کر سرعت سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

''تو یہ سب کچھ پھر کیا ہے۔'' غم و غصے نے اس کی آواز کو مغلوب کر لیا تھا۔''

''اگر کوئی خود ہی پاگل ہو جائے تو میں کیا کروں۔'' اس نے یوں کندھے اچکائے جیسے کندھوں پر پڑے بوجھ کو جھٹک رہا ہو۔

''انسانی حدود کو پھلانگ کر دیوتا بننے کی خواہش میں نے کبھی نہیں کی۔اس کی احمقانہ حرکات محض اس لیے برداشت کرتا ہوں کہ وہ کسی جذباتی دھچکے سے دوچار نہ ہو جائے۔'' وہ اپنے گول گول شیشوں والے چشمے میں سے سارے ماحول پر تیزی سے نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ جیسے تمام مناظر ایک ہی منظر

کا ایکشن ری پلے ہو۔

''ہم ڈاکٹر لوگ قریب المرگ مریض کو اس کی حتمی موت کے بارے میں نہیں بتایا کرتے کہ وہ قبل از وقت موت سے دو چار نہ ہو جائے اسے ہم سڈن ڈ-تھ کہتے ہیں۔''

''تو تم اسے سڈن ڈ-تھ سے بچانے کے لئے قسط وار موت دے رہے ہو۔''

''تم کہہ سکتی ہو۔ بعض اوقات یہ ناگزیر ہو جاتا ہے، کہ مریض کے اعضا کاٹ کر اسے اپاہج بنا دیا جائے۔''

یہ ڈاکٹر بڑے ہی میکانکی اور پیشہ ورانہ انداز میں کہتا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ ہم مریض کو بچا نہیں سکے۔ کس قدر گھناؤنا اور اذیت وہ تھا یہ سب کچھ سننا۔ دنیا اپنے محور کے گرد جوں کی توں گھومتی رہی۔ سکول کے احاطے میں کھڑے اونچے اونچے درخت اور بلند و بالا عمارت سب کچھ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اور وہ سفاک ڈاکٹر حادثاتی طور پر موت سے دو چار ہونے والی لاش پر سفید چادر ڈال کر آگے بڑھ چکا تھا۔

''میں یہ سب کچھ ثمینہ کو بتا دوں گی۔''

اس نے پیچھے سے چلا کر کہا

''ضرور بتا دینا بڑا احسان ہوگا مجھ پر، جس بات کو کہنے کی ہمت میں خود میں نہیں پاتا وہ آپ کہہ دیجیے گا۔ اور اس کے بعد اگر ممکن ہو تو پھر میری عرضداشت پر غور کر لیجیے گا۔''

ذلیل، کمینہ، فریبی، بڑے ہی معمولی، بے معنی اور سطحی سے لفظ، ایسی خبیث سیرتوں کے لیے موزوں الفاظ سے تمام زبانیں کیوں تہی ہیں شاید لفظ ظاہر کے ترجمان ہیں اور ظاہر باطن سا گھناؤنا اور مکروہ نہیں ہوتا۔

موٹر بائیک کی مجرمانہ آواز تا دیر اس کے کانوں میں زہر گھولتی رہی۔ اندھے، گونگے، چیرہ دست لمحوں کی صلیب پر چڑھے، روشنیوں کے دیے جھلملا جھلملا کر بجھتے رہے۔

انہی جلتی بجھتی روشنیوں میں ثمینہ کی ویل چیئر کی گڑگڑاہٹ بادلوں کی خوفناک گرج کی مانند سنائی دی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس چلی گئی۔ ''ثمینہ ڈاکٹر عامر آیا تھا۔''

آنکھوں کے سارے ہی دیپ یکبارگی روشن ہو گئے جیسے شب تاریک میں ندی کنارے چاند

اتر آئے۔

''ثمینہ وہ کچھ ٹھیک نہیں ہے'' آنکھوں کے جگنو جھلملا کر رہ گئے'' جلدی بولو'' سینے میں دم رکنے لگا۔

ناہید کی آنکھوں میں وہ کریہہ چہرہ لہرا گیا۔ اس نے کراہت بھرا کف ہونٹوں کو سکیڑ کر دور گندے نالے میں پھینکا۔

''ویسے تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔''

''کیوں کچھ کہا اس نے'' سانسوں کی ڈور الجھنے لگی۔ سینے کی دھونکنی میں دم گھٹنے لگا۔

قریب المرگ مریض کو اس کی یقینی موت کے بارے میں بتانا اسے قبل از وقت موت سے دوچار کرنا ہے، اسے سڈن ڈیتھ کہتے ہیں۔ تو کیا وہ ڈاکٹر سچ کہتا ہے۔

مزید ایک حرف محض ایک حرف آکسیجن ماسک اتار پھینکے گا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ ڈرپ کی سوئی نکل جائے گی۔ لال لال خون سے لبریز بوتل کا منہ بند ہو جائے گا۔ زندگی سے دھڑکتی نسیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں گی۔

''بولو نا ناہید بولتی کیوں نہیں بولو؟''

خزاں رسیدہ پتے بگولوں کی زد میں آئے اپنے ہی بریدہ وجود کو پٹخ پٹخ کر دھنک رہے تھے۔ پختہ فرش پر بچھے زرد پتے ہواؤں کے دوش پر بھاگتے چلے جاتے اور ہواؤں کے جابر ہاتھ بے شمار مزید پتے درختوں سے نوچ کر پھر روش پر بچھا دیتے۔ ثمینہ کے بے حس ہونٹوں پر نزعی حرف دم توڑ رہے تھے۔

''بولو۔ بولتی کیوں نہیں آخر تم...... ''بولو نا......''

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں...... میں تو ایسے ہی...... بس ایسے ہی، مذاق کر رہی تھی۔''

''مذاق''

سڈن ڈیتھ کا مہیب اور عفریت زدہ سکوت جیسے ناہید کے چہرے پر چھا گیا۔

راکھ ہوتی زندگی کا منظر نامہ

اوراس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ کبھی اس فلیٹ کے سامنے سے نہیں گزرے گا۔ جس کی ادھ کھلی کھڑکی میں کھڑی ایک ڈھلتی جوانی والی لڑکی اسے ایک ٹک دیکھتی چلی جاتی ہے۔ جس کی پوری کھلی ہوئی منتظر آنکھوں میں راکھ سی بھری ہے جس کی ساکن پلکوں پر گئے موسموں کی دھول جمی ہے اور جو اپنے گزرے ہوئے بے شمار لمحوں کا خراج اس سے مانگ رہی ہے۔ وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنے جھکے ہوئے سر کو مزید جھکا لیتا ہے جیسے مدعی کی مظلوم اور استفہامیہ نگاہوں کا سامنا کرنے کی اس میں قطعاً سکت نہ ہو اور اس کا جرم اس کے ضمیر پر ایک وزنی اور ناقابل برداشت سل بن چکا ہو۔ اپنی راکھ راکھ آنکھوں میں پوری کی پوری سمٹ آنے والی اس لڑکی کے بارے میں وہ مزید کچھ نہیں جانتا۔ اس نے تو کبھی اس کے فلیٹ نمبر کو بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی جو اس کے نام کا ہی متبادل بن سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بہت قریب سے جانتا ہے۔ وہ اس کے جلتے بجھتے لمحوں کی تپش اور بے رحمی میں شریک ہو چکا ہے وہ اس کی پتھرائی ہوئی ساکن پتلیوں والی ویران آنکھوں میں موت بھرتی ہوئی محسوس کرتا ہے اور وہ اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دیتا ہے جیسے اسے خوف ہو کہ طلب اور سپردگی کا قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا یہ زہر کہیں اس کی قوت بصارت ہی نہ سلب کر لے۔

وہ ہر روز اس کھڑکی کے نیچے سے گزرتا ہے اور ہر بار غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں اوپر اٹھ

جاتی ہیں اور وہ گڑ بڑا کر اور تیز چلنے لگتا ہے۔ جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے اور اسے ڈر ہے کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو بت بن جائے گا اور پھر جانے کیوں انتہائی غیر محسوس طریقے سے اس بھسم بھسم راکھ میں دبی دبی چنگاریاں سی جھلملانے لگیں۔ تب وہ لرزا اور اس نے سوچا کہ وہ ان چنگاریوں کو بجھنے نہ دے بلکہ ان کو جاودانی بخش دے۔ لیکن پھر اسے اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ وہ کن کن آنکھوں کی چنگاریوں کو بجھنے سے بچا سکے گا۔ وہ تو ان راکھ آنکھوں کے بھنور میں گھر گیا ہے۔

اس سے ہٹ کر تیسرے فلیٹ میں رہنے والی وہ لڑکی جو اپنی معذور ماں کے ساتھ تنہا رہتی ہے اور کسی چھوٹے سے سکول میں ملازمت کرتی ہے جس کی آنکھوں کی چنگاریوں کی چمک ابھی ماند تو نہیں پڑی لیکن وہ جانتا ہے کہ اگر ان چنگاریوں کا خراج ادا نہ کیا گیا تو وہ بھی راکھ ہو جائیں گی اور شاید راکھ ہونا ان کا مقدر ہے۔ یا نکڑ والی دکان میں بیٹھی وہ لڑکی جس کا باپ اس کے پاس بیٹھ کر دن بھر اس کی نگرانی کرتا ہے جو بصارت کے ساتھ ساتھ سماعت کی قوت سے بھی محروم ہے لیکن پتہ نہیں اپنی کس حس سے اس چڑھتی جوانی والی لڑکی کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ لڑکی جو دن بھر سودا تول تول کر دیتی ہے اور سودا پکڑاتے وقت گاہک کو ایک بڑی ہی خطرناک قسم کی مسکراہٹ سے بھی نوازتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ مسکراہٹ زہر بن کر پھیل جاتی ہے اس نے لمحہ بھر کو سوچا کہ اس خطرناک ہوتی مسکراہٹ کو وہ سمیٹ لے لیکن اس کے ارادے اور فعل میں صدیوں کے فاصلے حائل ہو جاتے ہیں۔

یا وہ لڑکی جو اوپر کی منزل کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے، جس کے ساتھ تین چار مرد رہتے ہیں اور وہ نہیں جانتا کہ ان کا اس لڑکی سے کیا رشتہ ہے لیکن اس نے اس خوش شکل لڑکی کے چہرے پر غازے کی دبیز تہ کے نیچے بھی راکھ کا ایک غبار اڑتا ہوا اکثر دیکھا ہے لیکن وہ اس غبار کو اس کے چہرے کی سیاہی بننے سے کیونکر روک سکتا ہے۔ کتنے اخلاقی اور سماجی خوف اس کو بے بس کر دیتے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ آنکھیں میچ کر سرعت کے ساتھ اس گلی سے بھی نکل جاتا ہے۔ تب اس کی سماعت سے اس معذور لڑکی کی چیخیں ٹکراتی ہیں جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اسے ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے۔ جس کی نارسا چیخیں اندھی اور بہری دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹتی ہیں۔ لوگ سنتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں جیسے کچھ نہ سن رہے ہوں یا ان کے پاس کچھ سننے کا وقت ہی نہیں ہے اور وہ جو بڑا احساس ہے وہ بھی تو یہی کرتا ہے تا کہ اس کے فلیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنے

قدموں کی رفتار کو مزید تیز کر لے اور وہ اپنی سماعت کو پتھرا لیتا ہے یہ زندہ سماعت اور یہ زندہ بصارت بھی کتنی کڑی آزمائش ہے۔ وہ بند آنکھوں اور بند کانوں کے ساتھ تنگ گلیوں سے بھاگتا ہوا فٹ پاتھ پر آ جاتا ہے اور اس شخص سے ٹکرا جاتا ہے جو منشیات کا عادی ہے اور کوئی سستا نشہ کیے دن رات فٹ پاتھ پر بے سدھ پڑا رہتا ہے اور لوگ اس کے اوپر سے پھلانگ پھلانگ کر گزرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے راستے میں کسی نے بوسیدہ چٹائی بچھا دی ہو۔

اور وہ جو انتہائی حساس دل رکھتا ہے وہ بھی تو یہی کرتا ہے تا کہ اس کے اوپر سے نہ پھلانگے بلکہ اس کی نیم مردہ ہڈیوں کے ڈھانچے کو بچا کر گزر جائے اور وہ اس اشرف المخلوقات سے بچنے کی کوشش میں اس نوجوان سے ٹکرا جاتا ہے جو اپنے تھکے بازوؤں میں فائلوں کا بوجھ اٹھائے دن بھر دفتروں کے چکر لگاتا ہے اور ناکام لوٹتا ہے۔ جس کی راکھ آنکھوں میں پتھر چہروں والی جوان بہنوں کا بوجھ بیمار بیوہ ماں کی اذیت اور بھوک کے خوفناک دیو کی عفریت ایک ہیولیٰ بنائے ٹھہر گئی ہے۔

وہ کدھر جائے وہ بے بس ہو جاتا ہے وہ ان راکھ راکھ آنکھوں کے ہجوم میں بری طرح گھر گیا ہے۔ تمام راستے ان پتھرائی آنکھوں کی راکھ میں گم ہو چکے ہیں وہ اس راکھ بھنور سے باہر نہیں نکل سکتا کیونکہ باہر نکلنے والی تمام راہوں پر عجب ازدحام ہے۔ وہ سب اوپر بہت اوپر جگمگانے والی روشنی تک پہنچنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں ہر زینے پر ہزاروں کا مجمع ہے۔ جن کے کھڑے ہونے کو جگہ ناکافی ہے وہ خود کو کھڑا رکھنے کے لیے دوسروں کو دھکیل رہے ہیں۔ مسل رہے ہیں گھسیٹ رہے ہیں۔ اور وہ سب سے نچلے زینے پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ وہ کبھی اوپر نہ جا سکے گا۔ کیونکہ وہ کسی کو دھکا نہیں دے سکتا وہ خود کو کھڑا رکھنے کے لیے دوسروں کو گرا نہیں سکتا۔ یہی اس کا المیہ ہے۔

پتھر دھڑ والی شہزادی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب زندگی ایک خواب کی مانند ہوتی ہے، اس خواب کی مانند جو شب کے اولین پہر میں دیکھا جائے اور پھر دم جس کے مٹے مٹے سے نقوش ذہن کے دھندلکوں میں بھولی بسری یادوں کی طرح ابھریں اور بکھر کر رہ جائیں۔ اس عہد کی کچھ باتیں جو ننھے منے ذہن کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیں وہ لاشعور کی پرتوں میں کچھ یوں راسخ ہو جاتی ہیں جیسے سفال گر کے ظروف میں پکاتے وقت اگر دراڑ پڑ جائے تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میری آئندہ پوری زندگی کا تعین اسی عہد میں ہو گیا تھا، اسی دھند لکے میں میری تمام زندگی کا نقشہ وضع کر دیا گیا تھا...... ایک سیدھی، مضبوط اور گہری لکیر کھینچ دی گئی تھی جس پر قدم بہ قدم مجھے چلنا تھا اور جس سے اِدھر اُدھر ہونے کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہی میں ایسا سوچ سکتی تھی۔ میری زندگی کا نقشہ مرتب کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ رستہ میرے ساتھ بہت دور تک چلے گا، اس پر سے نہ ہی کبھی میرا پاؤں پھسلے گا اور نہ ہی کبھی یہ بودا ثابت ہوگا۔

اس رات کو میں چاہوں بھی تو خود سے کبھی جدا نہیں کر سکتی جب میں سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں اماں کے پہلو میں دبکی بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی اور ذہن میں گڑیا کے بیاہ کے منصوبے بنا رہی تھی جب ساتھ والے پلنگ پر بیٹھی پھوپھو نے اماں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''دیکھو سعیدہ! فرح میری بیٹی بنے گی۔ جواد اور فرح کی جوڑی خوب سجے گی، اب بھی دونوں

میں گاڑھی چھنتی ہے۔اکرم بھیا سے میں نے بات کی تھی، وہ تو رضامند ہو گئے تھے مگر تمھاری رائے کے بغیر تو کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا نا!''

امی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا تھا:

''باجی! میری بھلا کیا رائے ہوگی لیکن بچوں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے......''

پھوپھو نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔''اے لو،سعیدہ! کیسی باتیں کرتی ہو، ہم بیٹی کوئی غیروں میں تھوڑی دے رہے ہیں، اپنے گھر سے اٹھے گی اور اپنے ہی گھر جائے گی۔ جواد اور فرح ہمارے بچے ہیں، ہم انہیں جس ڈگر پر چلائیں گے اسی پر چلیں گے۔تم یونہی وسوسوں کو دل میں جگہ نہ دو۔''

ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔''خیر، آپ کی خواہش میری خواہش ہے۔خدا ہمیں اپنے عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد دے۔''

میں اس وقت کچھ زیادہ تو نہ سمجھ سکی تھی البتہ اتنا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا اور جواد کا ذکر ساتھ ساتھ ہورہا ہے، تب میں ساری کی ساری اپنی قوت سماعت میں سمٹ آئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اور ایسی باتیں کریں، میری اور جواد کی باتیں، اچھی اچھی باتیں...... میں نے لحاف میں سے ایک آنکھ کا سوراخ بنا کر دائیں طرف بچھے پلنگ کو دیکھا تھا جس پر جواد بے خبر سو رہا تھا۔اس کے نازک نازک نتھنے سانس کے زیرو بم سے ہلکے ہلکے تھرتھرا رہے تھے۔اس کے گہرے عنابی لبوں کے گوشے آپس میں بھنچ گئے تھے اور وقفے وقفے بعد انہیں یوں جنبش ہوتی تھی جیسے وہ کچھ چبا رہا ہو۔وہ مجھے بے حد اچھا لگا تھا بالکل اپنا اپنا سا۔اس رات کے بعد دھیرے دھیرے جیسے غیر شعوری طور پر میں اس کی تابع ہوتی چلی گئی، اس کی ہر بات ماننا گویا میرا فرض بن گیا۔یہ لڑکیاں کسی کی تابعداری قبول کرنے کی ہی منتظر کیوں رہتی ہیں جیسے یہی جذبہ ان کے خمیر میں گوندھ کر انہیں بنایا گیا ہو۔اپنی زندگی، زندگی کے سارے لمحے اور اپنا سب کچھ لٹا کر کسی کو خود پر حکمران بنالینا بظاہر کیسا گھاٹے کا سودا ہے لیکن اس گھاٹے کے سودے پر بھی خود کو فاتح سمجھنا، یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے...... کئی بار میں نے چاہا کہ میں جواد سے کہوں کہ اماں اور پھوپھو میری اور تمھاری باتیں کرتی تھیں، عجیب عجیب سی باتیں مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ بات کو شروع کس جگہ سے کروں البتہ میرے ذہن میں وہ رات آئینے کے بال کی طرح راسخ ہوگئی، وہی رات تھی جس نے میری آئندہ زندگی کا فیصلہ کر کے میری پیشانی پر کندہ کر دیا۔

یہ مبہم سی نہ سمجھ آنے والی عجیب سی باتیں آہستہ آہستہ روشن ستاروں کی طرح واضح ہونے لگیں۔
تب اس رات کا حسین تصور اپنے جلو میں ڈھیر سارے سندر سپنے سمیٹے میری پوری ہستی پر چھا گیا جیسے چاند، ستاروں کے جھرمٹ میں گھر جائے جیسے پھولوں کی شہزادی پھولوں کی پوشاک زیب تن کیے کسی پھلواری میں دھیمے دھیمے چہل قدمی کررہی ہو اور اس کے چاروں اور نازک پنکھڑیوں کی پھوار ہلکے ہلکے برس رہی ہو اور اس وقت تو اس خواب پر جیسے سرمستی چھا گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ جواد بھی اس خواب سے آگاہ ہوگیا ہے اور اسے بھی یہ خواب بڑا ہی اچھا، بڑا ہی رنگین، بڑا ہی دلپذیر اور بڑا ہی دلکش معلوم ہوا ہے۔ تب میں آپ ہی آپ شرمانے لگی جیسے خود سے بھی چھپ رہی ہوں۔ جواد کچھ زیادہ شوخ اور بے باک ہوگیا۔ وہ فارغ وقت ہمارے گھر ہی گزارتا۔ گھر کے سب افراد اس کی یوں دیکھ بھال کرتے جیسے شیشے کا نازک سا کھلونا ہو جو ذرا سی ٹھیس بھی سہار نہ سکے گا۔ اس کی نظریں ہمہ وقت میرے تعاقب میں رہتی تھیں، جہاں جاتی وہیں پہنچ جاتا۔ کبھی باورچی خانے میں گھس آتا، ایسے بدحواس کرڈالتا کہ کوئی کام بھی مجھ سے ڈھنگ سے نہ ہو پاتا۔ میں عاجز آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی۔

''خدا کے لیے جواد! یہاں سے اٹھ جاؤ ورنہ میں اس قدر پھوہڑ مشہور ہوجاؤں گی کہ پھوپھو دور سے ہی سلام کرکے منہ پھیر لیں گی۔''

''مذاق میں بھی ایسی بات نہ کیا کرو، دل کو دکھ ہوتا ہے......'' وہ یک دم سنجیدہ ہوجاتا۔

''......اور پھر مجھے ستاتے بھی کس قدر ہو۔'' میں کہتی۔

''یہ تو ما بدولت کا بلاشرکت غیرے حق ہے اسے ہم سے کون چھین سکتا ہے۔'' وہ خالص جاگیردارانہ انداز میں اکڑ کر کہتا۔

کبھی چھت پر چلا آتا، راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا، میں گھبرا کر کہتی۔

''ہٹ جاؤ جواد! کوئی آجائے گا، تو کیا کہے گا۔''

وہ اور تن کر کھڑا ہوجاتا اور دیدہ دلیری سے کہتا۔ ''تو آجائے، کوئی چوری تھوڑی ہے۔''

''لیکن اب تو جانے دو، نیچے ہنڈیا جل جائے گی۔''

''ہنڈیا کا جل جانا میرے دل کے جل جانے سے زیادہ اہم ہے؟''

''تمھارا دل......'' مجھے ہنسی آجاتی۔

''ہاں، میرا دل جل کر کباب ہو چکا ہے لیکن تمھیں کس طرح دکھاؤں جب کہ تمہارے پاس تو وقت ہی نہیں ہے۔'' وہ رونی صورت بنالیتا۔

''......اور میں اس کباب میں ہڈی ہوں۔'' میں دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر آتی۔

زندگی بڑی حسین ہوگئی تھی، ہر سو حسن ہی حسن بکھرا لگتا تھا جیسے حسن کی دیوی میرے آنگن میں اتر آئی ہو۔ ہر سو ہزاروں ہی شوخ رنگ بکھر گئے، ہر شے نور میں ڈھل گئی تھی۔ یہ دنیا بھی تو ہمارے دل کی دنیا سے اپنا اثبات حاصل کرتی ہے۔ایک کیفیت میں جو چیز بہت سندر، بہت دلکش معلوم ہوتی ہے دوسری کیفیت میں وہی چیز پر ہیبت معلوم ہونے لگتی ہے۔اس کائنات رنگ و بو کی معنویت بھی ہمارے دل کی کائنات سے وابستہ ہے۔

جواد ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، ہمارے قصبہ میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ تھا اس لیے جواد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک دوسرے شہر جانا پڑا۔ جاتے سمے اس نے بڑی افسردہ اور پر عزم سی نظر مجھ پر ڈالی، وہ لمحہ میری زندگی کے چند بہترین لمحوں میں سے ایک تھا جسے زیست کا عنوان کہا جائے جیسے کہہ رہا ہو کہ فرح! میں تمھارے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے ہی تو جارہا ہوں۔ میں محنت کروں گا، سخت محنت تاکہ تمھیں وہ مبارک گھڑی بہت جلد دے سکوں، پھر میں تنہا تو جا نہیں رہا، ساتھ گزرے ایک عہد کی حسین اور انمٹ یادیں میری رفیق ہوں گی۔ دیکھو، تمہاری یہ افسردگی میرے پیروں کی زنجیر بن جائے گی...... اور میں نے اپنے آنسو اس سے چھپا لیے تھے۔

جواد چلا گیا زندگی کو ایک اور موڑ دے کر، انتظار کے کیف آگیں اذیت دہ لمحوں کا شمار کرنے کے لیے، حسین سپنوں کے سنہری تاروں میں الجھنے کے لیے، یہ انسان زندگی میں اتنے خواب کیوں بنتا ہے۔ چکوری کی آرزو کی طرح تمام عمر ان خوابوں میں الجھتے الجھتے بکھر جاتا ہے۔ یہ شیخ چلی کا نام تو ہم نے یونہی بدنام کر رکھا ہے ورنہ کون شخص ہے جو زندگی کے کسی عہد میں، کسی دور میں، کسی عمر میں خوابوں کے تاج محل تعمیر نہیں کرتا، بلند و بالا تاج محل! چاہے ان کے نیچے بنیاد بھی نہ ہو، اس خدشے سے بے خبر کہ اگر یہ دھڑام سے نیچے آن گرے تو آئینے کی طرح سارا وجود چیخ کے رہ جائے گا لیکن میرے تاج محل کی اساس تو بڑی مضبوط اور بڑی گہری تھی۔ یہ صرف میرا نہیں بلکہ ہر شخص کا یقین تھا۔

جواد جب بھی تعطیلات میں گھر آتا، سیدھا ہمارے گھر چلا آتا، اس حالت میں کہ اس کے لباس

اور چہرے پر سفر کی گرد ابھی اسی طرح جمی ہوتی، ہر ایک سے یوں ملتا جیسے مدتوں سے منتظر تھا، مجھ پر نظر پڑتی تو نظریں یہ کہتی دکھائی دیتیں کہ بڑے کڑے لمحوں کو جھیل کر آیا ہوں۔

مجھے ان دنوں تاریخیں اور دن از بر رہا کرتے۔ تعلیمی اداروں کے شیڈول مجھے حفظ ہو گئے تھے اور میری تمام حسیات ایک نقطے میں مجتمع ہو کر دروازے پر سنائی دینے والی بوٹوں کی آہٹوں میں مقید ہو گئی تھیں۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی ہر آواز جیسے میرے دل پر بھی دستک دے جاتی تھی اور میں ہر کام چھوڑ کر یوں چوکنا ہو جاتی جیسے میری موت یا زندگی کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو، میں ہر ایک کو قدموں کی چاپ سے پہچان جایا کرتی تھی، دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا ہر ایک کا انداز مجھے یاد ہو گیا تھا۔

میں نے جب ثانوی تعلیم مکمل کی تھی تو کسی نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے مزید پڑھنا چاہیے۔ خود مجھے بھی اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی، یوں بھی گھر چھوڑ کر دوسرے شہر میں جاتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی آہٹوں کے انتظار سے آزاد ہو گئی تو خالی رہ جائے گی، بالکل کھوکھلی، ساز کے سُر کھو جائیں تو اس کی قیمت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ انسان کی حسیات چھین لی جائیں تو انسان ہی کیا رہ جاتا ہے۔ سب میرے بارے میں یوں مطمئن تھے جیسے میری منزل ایک دو گام ہو اور مجھے کسی زادِ راہ کی ضرورت نہ ہو، دریا کی سطح پر سکون ہو، ناؤ مضبوط ہو اور ناخدا ہوشیار ہو تو خوف کس بات کا مگر کون جانے کہ کشتیاں تو ساحل سے لگ کر بھی ڈوب جاتی ہیں۔ یہ زندگی تو کرکٹ کے کھیل کی مانند ہے۔ کیا جانیے، کس وقت جیت ہار میں بدل جائے۔

یہ خواب جتنے نازک ہوتے ہیں، ٹوٹنے پر ان کی کاٹ بھی اسی قدر شدید ہوتی ہے اور مجھے یہ کاٹ اس وقت محسوس ہوئی تھی جب ایک روز جواد ہمارے گھر آیا تو اس کے لباس اور چہرے پر سے سفر کی گرد دھلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں، اس کی باتیں ٹھوس اور لہجہ بے لوچ تھا، چائے کے اصرار پر اس نے کہا تھا کہ اس نے چائے پینا چھوڑ دی ہے۔ تب میرے اندر بڑے زور کا دھکا کا ہوا تھا جسے میں نے خوش فہمیوں کے سہارے سہار لیا تھا لیکن پھر یہ خوش فہمیاں مجھے اپنی فولادی گرفت میں جکڑ کر بے بس کرنے لگیں کیونکہ دروازے کے بند ہونے اور کھلنے کی صدائیں میرے من پر اپنے بھاری ہاتھوں سے دستکیں دیتی رہیں۔ بوٹوں کی آہٹ میری تمام حسیات کو اشتیاق کے آخری نقطے پر لا کر نڈھال چھوڑتی رہیں۔ میری آنکھیں انتظار کی آخری انتہاؤں میں محبوس ہو کر پتھر ہو گئیں مگر جواد پھر نہ آیا۔ تب میں ایک

روز جواد کے گھر گئی وہ اپنے کمرے میں تھا۔ میں بے دھڑک اس کے کمرے میں داخل ہو گئی وہ مسہری پر آلتی پالتی مارے دیوار کی طرف منہ کیے شاید کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں جا کر اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ وہ اس قدر محو تھا کہ اسے احساس تک نہیں ہوا۔ میں نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کر وہ ورق اس سے چھیننا چاہا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیوری چڑھا کر بولا۔

''تم جیسی چھوٹی ذہنیت کی لڑکی سے ایسی ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ چھپ کر دوسروں کے نجی خطوط پڑھے۔ تمھاری اس نیچ حرکت کا مجھے ذرہ بھر بھی ملال نہیں ہوا کیونکہ اس سے زیادہ کی تم سے توقع رکھنا ہی نادانی ہے۔''

میں تو ششدر رہ گئی...... جب زلزلے آتے ہیں تو کائنات ہل جاتی ہے، زمین کیا اگلتی ہے کیا نگلتی ہے۔ یقیناً یہ وہ جواد نہیں تھا جسے میں بچپن سے جانتی تھی، جس کے ساتھ میں مدتوں کھیلی تھی، ساتھ پلی بڑھی تھی اور جس کے ساتھ شعور کی ابتدائی منزل سے ایک عجیب سا ناتا بندھ گیا تھا، یہ تو اس کے سراپے میں کوئی اور بول رہا تھا جو میرے لیے قطعی غیر شناسا اور اجنبی تھا۔

''جواد! تم نے ذرا سی بات کا کتنا اثر لیا...... بخدا میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تمھارا خط پڑھنے کا میرا بالکل کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر بھی تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔''

میں روہانسو ہو گئی۔ وہ دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھر کہا۔

''دیکھو جواد! ایسی باتیں نہیں کرتے جو دوسروں کو دکھ دیں۔''

''فرح! میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں۔'' اس نے بے لوچ لہجے میں کہا۔

میں دو قدم اس کے قریب آئی اور آہستگی سے کہا۔

''دل سے کہہ رہے ہو، جواد!''

وہ پاؤں پٹختا ہوا مسہری کی دوسری جانب جا کھڑا ہوا اور ٹھوس سے انداز میں بولا۔

''کچھ سمجھ لو، مجھے اس وقت تنہائی چاہیے۔''

میں بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آئی، پتہ نہیں کیسے، حیرت کی بات ہے کہ میں نہ تو پاگل ہوئی اور نہ ہی خودکشی کر سکی۔ شاید میرے حواس اور عمل کی تمام قوتیں پتھر اور اعصاب شل ہو گئے تھے۔ اب مجھ سے کوئی مثبت یا منفی ردعمل ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے اندر کا سارا انسان کاٹھ کا ہو گیا تھا جسے

جنبش دینے والی اب کوئی قوت باقی نہ بچی تھی۔ مجھے اسی روز معلوم ہو گیا تھا کہ میرے خواب اپنی تعبیر پانے سے پہلے ہی چکنا چور ہو گئے ہیں اور ان کی کرچیاں میری نس نس میں پیوست ہو گئی ہیں۔ میں نے گھر آکر اپنی بہن نورین سے کہا تھا:

''برج تک پہنچنے کے لئے جس سیڑھی کا میرے لیے انتخاب کیا گیا تھا وہ بہت کمزور ثابت ہوئی، مجھے دو چار قدم بھی اوپر نہ لے جا سکی۔''

اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا تھا:

''کیسی بے مقصد اور مبہم سی باتیں کرتی ہو، آپا! اماں اگر سنیں تو تمھیں کس بری طرح جھڑکیں۔''

''اونچی فضا میں اڑنے والی پتنگ کٹ بھی جائے اور جس ہاتھ میں اس کی ڈور ہو، وہ سمجھتا رہے کہ پتنگ سلامت ہے کیونکہ اس کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے تو کیسی عجیب بات ہے۔''

جواد پھر ہماری طرف نہیں آیا۔ اس کی اس سرد مہری کو سب اس کی مصروفیت کی وجہ گردانتے رہے۔ پھر پتہ چلا کہ وہ آدھی چھٹیاں گزار کر چلا گیا ہے کیونکہ یہاں اس کی پڑھائی میں ہرج ہوتا تھا۔ تب زندگی آہٹوں کے طلسم سے آزاد ہو گئی اور پھر کھو کھلی رہ گئی۔

پھر وہ دوبارہ اس وقت واپس آیا جب وہ ڈاکٹر جواد کہلاتا تھا۔ یہ وہ دن تھا جس کے خواب میں نے برسوں دیکھے تھے، جس کے انتظار میں، میں نے پل گنے تھے اور لمحوں کا شمار کیا تھا لیکن شاید میری ریاضت میں کہیں کمی رہ گئی تھی۔ میرے گھر والوں نے اس کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کے ہمراہ آیا تھا۔ اس عرصے میں وہ بہت نکھر آیا تھا۔ اس دن وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تفاخر کی چمک تھی۔ وہ تمام وقت گردن اکڑائے ایک جگہ یوں بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا جیسے سامنے دیوار کے وسط میں کچھ لکھا ہوا ور وہ بڑے انہماک سے اسے پڑھ رہا ہو۔ یہ شخص مجھے اب بھی اچھا لگ رہا تھا جس نے اتنی خطرناک بلندی سے مجھے دھکا دیا تھا کہ میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی۔ اس کے آتے ہی میرے گھر بڑے بڑے بکس اور صندوق کھلنے اور بند ہونے لگے اور بار بار بازاروں کے چکر لگنے لگے تھے جیسے ایک طے شدہ منصوبے کی مقررہ تاریخ پر اس کی تکمیل کا کام بنا کسی حیل و حجت شروع ہو جائے ۔ میں لاتعلق سی بنی خاموش تماشائی کی صورت سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہر شخص اپنے طور پر آنے والی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے حسب استعداد اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ ہر فرد خاندان کی اس پہلی شادی کے تصور

سے شادمان پھر رہا تھا، ہر ایک کی نظریں دروازے پر لگی رہنے لگی تھیں کہ جانے کس وقت اس بے انتہا خوشی کا سندیسہ جانفزا ان کو پہنچ جائے۔ کئی بار پھوپھو بھی آئیں اور ہر نگاہ ان کے چہرے کی کیفیات کا جائزہ بڑی گہرائی سے لیتی رہیں، سب ایک متوقع بات سننے کے منتظر رہے لیکن یہ انتظار اس وقت کچھ مایوسی میں بدل گیا جب پتہ چلا کہ ڈاکٹر جواد واپس جا رہا ہے۔ بعد میں پھوپھو نے بتایا کہ جواد کا خیال ہے کہ وہ ہاؤس جاب مکمل کر لینے کے بعد شادی کرے گا، وہ پھر ایک وعدہ دے گیا تھا اور سب نے اس کے وعدے کا یقین کر لیا تھا۔ میں سب کو کیسے سمجھاتی کہ وہ تو بزدل ثابت ہو رہا ہے کہ دل کی بات کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ یہ شاید خاندانی روایت و اقدار کا اثر تھا یا شاید وہ اس طوفان سے خائف تھا جو اس کے فیصلے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا یا شاید وہ اس بے جا فیصلے کی سزا دینا چاہتا تھا جسے نادانی میں اس نے بھی تسلیم کر لیا تھا یا شاید وہ میری عبادتوں کی جزا دے رہا تھا اور سب قیافہ شناسی کے دعویدار بری طرح ناکام ہو گئے تھے، شاید ہمارے بزرگ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی بچہ ان کے کسی اٹل فیصلے سے انحراف بھی کر سکتا ہے۔

ایک روز جب میں نے اماں سے کہا کہ اماں! میں نہ کہتی تھی کہ یہ شادی نہ ہو سکے گی تو انھوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا:

''اے لڑکی! کیا بدشگونی بکتی ہے۔ کیونکر نہ ہو سکے گی، تو مر جائے گی یا خدانا خواستہ ہم نہ رہیں گے؟''

نورین نے فوراً نوالہ دیا تھا۔ ''اماں! یہ آپا یونہی کہتی رہتی ہیں، پتہ نہیں کون جوتشی انھیں مستقبل کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔''

میں نے بے بسی سے کہا تھا۔ ''نورین! جو میں جانتی ہوں، تم نہیں جان سکتیں۔ اگر جان جاؤ تو خدا کی قسم، مجھ جیسی بات ہی کہو۔''

ماں نے مجھے پھر ڈانٹا تھا۔ ''چپ رہ، اے لڑکی! جو منہ میں آتا ہے بولتی چلی جاتی ہے۔ غضب خدا کا! لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے، ایک ہمارا زمانہ تھا کہ گھر میں ایسا کوئی ذکر بھی ہوتا تو بھاگ کر اگلی کوٹھڑی میں جا چھپتے تھے اور ایک آج کا زمانہ ہے کہ لڑکیاں بزرگوں سے پہلے بولتی ہیں۔''

میں خاموشی سے اٹھ آئی تھی۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں اپنی ایک رشتہ کی خالہ کے گھر گئی تھی جو تنہا رہتی ہیں، جنھوں نے اپنی تمام

عمر اس شہزادے کے انتظار میں کاٹ دی ہے جس کے نام کا نقش شروع دن سے ان کی پیشانی پر کھود دیا گیا تھا اور جو اس کھونٹ میں شکار کھیلنے چلا گیا تھا جس میں جانے کی اسے سختی سے ممانعت تھی۔ پھر وہ لوٹ کر کبھی نہ آیا تھا اور وہ اس کے انتظار میں قید آدھے پتھر کے دھڑ والی شہزادی کی طرح لمحوں کا شمار کرتے کرتے خود ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں۔

اس شام جب سرما کا سرد اور اداس اندھیرا چہار سو پھیل گیا اور بے ترتیب سا کمرہ اندھیرے کی خوفناک گرفت میں سمٹ گیا تو میں نے کہا تھا۔

''خالہ! یہاں روشنی نہیں ہے۔''

انھوں نے اپنی ساکن پتلیوں والی خالی خالی آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں جن کی تمام جوتیں گل ہو چکی تھیں اور جن میں سرد راکھ بھر گئی تھی۔

''نہیں، مدت ہوئی میں نے روشنی کرنا چھوڑ دیا ہے۔، اچھی نہیں لگتی۔'' برف کی قاشوں کے سے لبوں سے عجیب سی آواز ابھری تھی۔'' آج تم نے روشنی کا نام لیا تو بڑا عجیب سا لگا۔ یہاں کون ہے جس کے لیے روشنی کی جائے؟''

مجھے لگا تھا جیسے آدھے پتھر کے دھڑ والی شہزادی مکمل طور پر پتھر کی ہو گئی ہے اور اب اس میں کسی منتر کے بول جان نہ ڈال سکیں گے۔

اگلے دو برس میں کوئی خاص تبدیلی تو نہ آئی البتہ میرے لیے جمع کیے ہوئے جہیز سے اکثر کمرے بھر گئے اور جو چیزیں پرانے رواج میں جا پڑی تھیں انہیں نئی چیزوں سے بدل لیا گیا تھا۔ پھوپھو نے بھی اپنے طور پر مجھے قیمتی ملبوسات اور زیورات سے آراستہ کرنے کے لیے تیاریاں زور وشور سے شروع کر دیں۔ ایک بار پھر تمام ساز و سامان سے لیس ہو کر فریقین اس کے انتظار میں پل اور گھڑیاں گننے لگے جس کے ہاتھوں اس امنگوں بھری تقریب کا فیتہ کٹنا تھا۔ پھر وہ آ پہنچا، ایک بار پھر آئندہ مسرتوں کے تصور سے سب کے چہرے گلنار ہو گئے۔ اس بار تو کسی قسم کی غیر متوقع بات ہو جانے کا احتمال ہی نہ تھا مگر وہ جو انتہائی بزدل واقع ہوا تھا اور جو دو لفظ کہہ کر اس کشمکش کی صورت سے ہر ایک کو نجات دلا سکتا تھا، پھر بزدلی دکھا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کا بہانہ بنا کر بہت دور چلا گیا۔

ایک بار پھر سب منتظر رہنے لگے، اس شہزادے کے انتظار میں لمحوں کا شمار کیا جانے لگا جو راستہ

بھٹک کراس طلسماتی محل میں داخل ہوگیا تھا جس سے باہر نکلنے کے تمام راستے گم ہو جاتے تھے جہاں ایک حسین وجمیل پری نے اس پر سحر پھونک کر اسے اپنے پاس قید کر لیا تھا اور وہ واپسی کے تمام راستے اب بھول چکا تھا مگر میں یہ بات سب کو کیسے سمجھاتی، ہر شخص کنارے پر کھڑا ہو کر دریا کو پایاب سمجھ رہا تھا اور میں گلے گلے ڈوبی ظالم موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ مگر جب دن ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے رینگنے لگے اور گزرتے ہوئے لمحوں کی اڑتی ہوئی دھول میرے خدوخال کو دھندلانے لگی اور ہر گزرنے والا دن اپنا انمٹ نشان مجھ پر چھوڑتا چلا گیا تب سب کو یکبارگی ہی خیال آیا کہ یہ انتظار تو بہت طویل ہوا جاتا ہے۔ اس وقت سب جواد کی کھوج میں لگ گئے۔ پھر جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ تو تین بچوں کا باپ بھی بن چکا ہے۔ سب نے مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ کسی کا کیا دوش ہے، بے چاری کی قسمت ہی بری تھی، مقدر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ نورین نے کہا تھا۔

''آپا! تم شروع ہی سے بدشگونیاں بولتی تھیں۔ آخر وہی ہوا نا!''

اور میں کہ جس کا آدھا دھڑ مدت سے پتھر کے مٹھ میں قید تھا ان جادوئی منتروں والے ساحروں سے اپنے وجود کی بھیک بھی نہ مانگ سکی۔

پٹھانی

پٹھانی کو آج تک کسی نے کبھی بولتے نہیں سنا تھا۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی زبان بولتی ہے،اس کی آواز کیسی ہےلفظوں کی ادائیگی اس کے لبوں سے کیونکر ممکن ہوتی ہے۔لیکن اتنا سب کو یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ وہ بول سکتی ہے۔یہ الگ بات کہ وہ خودنہیں بولتی تھی،اس کی زبان سے یہ خبیث جنات بولتے تھے۔جنھوں نے پچھلے پچاس برس سے اس کے وجود کی گٹھڑی کو کھوکھلا جان کر اپنا مسکن بنا لیا تھااور جو کبھی لمبے سریلے سروں میں بین کر کے روتے تھے،کبھی ہسٹریاتی چیخیں مار کر چلاتے تھےاور کبھی سسکیوں اور سبکیوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے غیر شنا سالفظ حلق میں ٹوٹتے اور بکھرتے رہتے۔ جیسے چھاج میں روڑ ملے دانے پھنک رہے ہوں۔

بڑے بوڑھوں کی زبانی معلوم ہوا تھا۔کہ آج سے پچاس برس پہلے جب وہ یہاں لائی گئی تو اس وقت وہ ایک نا شنا ساز بان بولتی تھی اور یہاں کی بولی سیکھنے کی کوشش بھی اس نے شروع کر دی تھی۔تب اس کی رنگت سرخ اور گلابی ،گلاب کی پتیوں سے کشید کی ہوئی تھی۔اس کی آنکھوں کی رنگت صدف کے چورے کے ہم رنگ تھی۔اور اس کا قد و قامت جنگلی کیکر اور بکائین کے بوٹوں کو شرماتا تھا۔بابا عطا اس حسینہ کو محض پینتیس روپے میں خرید کر لا یا تھا۔لیکن یہ انتہائی درشت خصلت،سخت رواور سخت جان کسان، اس کے آتے ہی چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔

اس کے پانچوں بیٹے، بہویں، چھ بیٹیاں، داماد اور بے شمار پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، جو ابھی تک پٹھانی کو پٹھانی ہی کہہ کر پکارتے تھے اور اماں، دادی یا نانی وغیرہ کہنے کے لیے مناسب وقت ملا ہی نہ تھا۔ پس وہ سب کے لیے محض پٹھانی ہی بن کر رہ گئی۔

پٹھانی کو جب عطا محمد کی موت کی خبر ملی تو اس نے کیکر کے کھردرے سیاہ تنے سے کلائیاں ٹکرا ٹکرا کر سرخ اور سبز چوڑیاں چکنا چور کر ڈالیں اور اس کی گول سنہری کلائیوں پہ خون کے موٹے موٹے قطرے آنسوؤں کی مانند ابھر آئے۔ جن میں چوڑیوں کا سنہرا چمک رہا تھا اور اس کے سونے کے تاروں جیسے بال دھریک کے بوٹے کے گرد چکراتے بگولے میں لپٹے گھوم رہے تھے۔ اجنبی زبان میں کیے گئے اس کے بینوں نے اس بوڑھے کے جنازے کو کسی نوجوان کی میت کی مانند سجا دیا تھا، حالانکہ اس کے لفظوں کے معانی سے تمام کان نا آشنا تھے لیکن جس درد و کرب سے وہ سینے پر دھمکے مار کر چیختی تھی کبھی رقت آمیز نہ ہونے والے مرد بھی اس سے دہل رہے تھے۔ عطا محمد کی بیوہ جو اس کے ساتھ چالیس برس کی ازدواجی زندگی گزار چکی تھی خود اسے اور اس کی بیٹیوں، نواسیوں اور پوتیوں کو بھی ماتم کا یہ سلیقہ اور قرینہ نصیب نہ ہوا تھا۔

جنازہ اٹھنے کے ساتھ ہی وہ دھول میں لپٹی گودڑ سا بنی سارے صحن اور مویشیوں کے باڑے میں لوٹتی رہی۔ گوبر کے بے شمار موٹے موٹے ٹکڑے، بھوسے اور خشک چری کے ڈنٹھل اس کی کھلی لٹوں اور وسیع و عریض لبادے میں لپٹ گئے۔ اور وہ مویشیوں کے کوٹھے سے ہوتی ہوئی چارے والی اندھی کوٹھڑی میں گھس گئی۔ جس کی ان لپی کچی دیواروں سے دن رات لپٹا گھور اندھیرا سسکیاں بھرا کرتا تھا۔ جہاں برسیم کے کاسنی اور لوسن کے سفید پھول جئی اور چری کے ڈنڈے سب مل کر گہری امس اور حبس پیدا کر دیتے۔ ایسا حبس کہ سبز چارہ کملا جاتا، مچھر اور سبزے کے سارے پروانے گھبرا کر رقص کناں ہو جاتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ عدت کی مدت پوری کر رہی ہے۔ پر عدت کی مدت گزرے بھی مدت گزر گئی۔ لیکن پھر دن کی روشنی اور شرینہہ کے پھولوں اور نالی کی پھلیوں کی باس میں لپٹی ٹھنڈی ہوا نے اسے کبھی مَس نہ کیا۔ جب تاریکی پیپل کی پھنگوں اور تمباکو کے کھیتوں کو ہموار کر دیتی تو پٹھانی سیاہ لبادے کے تابوت میں لپٹی باہر نکلتی اور پانی کا کوزہ بھر کر اندر لے جاتی اور پھر اگلی رات تک وہیں مقید ہو جاتی۔

بابا عطا کی پوتیاں صبح و شام ایک تنوری روٹی پر ذرا سا گڑ کا ٹکڑا یا ماسہ سی لال مرچ کی چٹنی دھر کوٹھڑی کے بے کواڑ کے در میں رکھ یوں واپس بھاگتیں کہ ان کے ننگے پاؤں خشک و تر گوبر سے لتھڑ

جاتے اور کوٹھڑی کی چھت میں بنے لالیوں اور چڑیوں کے گھونسلوں میں پرندے پھڑ پھڑانے لگتے۔

جیٹھ ہاڑ میں جب حدت ابل کر آبلہ پا ہو جاتی جب درخت سلگتے، زمین سے بھاپ اٹھتی، درختوں کے تنوں، پتوں، فصلوں، کسانوں کے بالوں پلکوں اور گالوں پر جمی دھول دہکنے لگتی، جانوروں کی زبانیں تالو سے لگ جاتیں اور پرندوں کے منہ کھل جاتے اس وقت پٹھانی اسی کوٹھڑی کے بھنبھار میں بھانبھڑ سی بھنتی رہتی۔

تبھی بابا عطا کے چھوٹے بھائی کے دل میں پٹھانی کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ گندم کی سنہری بالیوں کی سی رنگت والی، سرسوں کی گندل سی ملوک لڑکی جو سر میں دھول ڈالے، بدن پر سیاہ لباس سجائے گرمیوں کی طویل دوپہریں اور سردیوں کی قیامت خیز راتیں، اس کال کوٹھڑی کے بطن میں کھب کر مٹی اور کلر بنتی جارہی ہے، کیوں نہ اسے دنیا کی ہوا لگوائی جائے۔ سو اس نے پٹھانی کو عقد ثانی کی ترغیب دینے کی ٹھانی۔ ایک دوپہر جب وہ سہاگے پر دونوں پاؤں کا وزن ڈالے بیگھوں کے بیگھے ہموار کر چکا، اس کے میل خورے کرتے سے پسینہ گر گر کر سرمئی مٹی کے تھالوں میں جذب ہونے لگا۔ تو اس نے راجباہ کے پانی میں کئی غوطے لگائے۔ عید، شب برات والا تہمد اور کرتا پہنا۔ بالوں کے ٹوکرے میں تیز بو والا کڑوا تیل ڈالا، اور پورے قد کو دُہرا کر پٹھانی کی کوٹھڑی کا در پھلانگ کر اندر چھلانگ لگائی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چاروں شانے چت بھینسوں کے پاؤں میں ہموار تھا۔ بمشکل تمام اس کے پانچوں جوان بیٹوں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ وہ مرتے دم تک کسی کو کچھ نہ بتا سکا بس یہی کہتا رہا۔

''خدا گواہ ہے وہ صورت پٹھانی کی نہ تھی۔

اس کے روپ میں کوئی اور چھپا تھا۔''

اس رات پہلی بار پٹھانی کے جنات بستی پر حملہ آور ہو گئے۔ کھڑی فصلیں اوندھی ہو گئیں۔ کھلیان بکھر گئے اور جانور اور انسان ریتلے ٹیلوں میں بھٹک گئے۔ پھر اس کے بعد کسی کو پٹھانی کے قریب پھٹکنے یا اس کے معمولات میں رخنہ ڈالنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔

وقت کے سنگین تکلے پر چڑھا پٹھانی کے وجود کو گوڑھا لپٹتے لپٹتے ادھڑنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں سوج سوج کر نوخیز بچے کی قبر معلوم ہونے لگے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی دُوہری ہو کر بالشت بھر باہر کو ابھر آئی تھی اور جسم کا بوجھ ایک ٹیڑھی میڑھی لاٹھی نے سہار لیا تھا۔

بابا عطا کی چوتھی نسل جوان ہو چکی تھی۔ پچھلے بیس، پچیس برس سے پنجاب کے دیہاتوں میں آنے والی خوشحالی نے اپنا کچھ حصہ اس گھرانے کو بھی بخشا تھا۔ سوانہوں نے کچا کوٹھا گرا کر پختہ مکان بنانے کا فیصلہ کیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پٹھانی کی کوٹھڑی بیچوں بیچ واقع تھی اور یہ مکان جس طرف سے بھی گرایا جاتا اس کوٹھڑی کا گرنا لازمی تھا۔ پٹھانی کو جب معلوم ہوا تو اس کے جنات نے اجنبی زبان میں وہ واہی تباہی بکی کہ بڑے بوڑھوں نے نوجوانوں کے پاؤں پکڑ لیے کہ خدا کے واسطے قہر خداوندی کو آواز مت دو۔ کیونکہ یہ بات طے تھی کہ جب بھی بستی میں کوئی ظلم ہوتا یا کوئی ناانصافی سرزد ہوتی۔ یہ جنات خلق خدا سے انتقام لیتے۔ رات رات بھر شوکاریں بھرتی سیاہ وسرخ آندھیاں، زمین وآسمان کو تہ و بالا کر ڈالتیں کنکر، پتھر، ٹہنیاں اور کاغذ انسانی وحیوانی جسموں پر اولوں کی طرح برستے۔ فصلیں الٹ جاتیں جیسے ان کے اوپر کوئی ہوائی مخلوق لوٹیں لگا لگا کر گئی ہو، اور کھیتوں کی زرخیز مٹی اڑ کر آسمانوں پر چڑھ جاتی۔

اگر چہ بابا عطا کے بیٹے کی بہوؤں نے پھر ان کے بیٹوں کی بہوؤں نے سال میں دو بار بیساکھ اور اسوج میں پٹھانی کی کوٹھڑی کو مٹی میں بھوسہ، گوبر اور لید ملا کر لیپا، چکنی مٹی میں لک اور لید ڈال کر دنوں بوری سے ڈھانپ کر رکھ چھوڑتیں اور جب اس کی ناگوار بو سارے ماحول کو متعفن کر ڈالتی اور سونے والوں کو سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ تب کوٹھڑی کے فرش پر تلن دیتیں، پٹھانی اس سارے وقت میں سیاہ چادر میں لپٹی ایک کونے میں دبکی رہتی۔ ہر عہد کی بہویں پٹھانی پر ہمیشہ ترس کھاتیں اور اس کی کسمپرسی پر چار آنسو ضرور بہاتیں۔ کبھی کوئی بہو مٹی کا تھوبا تھپ کر کے دیوار سے نکاتی اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے بالوں کی لٹ پیچھے دھکیلتے ہوئے کہتی۔

''پٹھانی کبھی تو بھی بول پڑا کر، کبھی تو بند کوٹھی کا جندرا کھول کبھی تو اندر کا ہسڑ باہر نکال۔''

دوسری بہو بچے کے منہ سے بھرے بھرے سینے کو کھینچ کر باہر نکالتی پانی ملے دودھیا قطرے سانولے چکنے پیٹ پر ٹپکتے رہ جاتے۔

''جیبھ کو تالا لگا جانے کن خزانوں کو سینے کے غار میں دفن کر چھوڑا ہے۔ کبھی تو من کا بھار ہلکا کر لیا کر۔ ہم تیری بولی نہیں سمجھتے تو پھر بھی بول۔ بول نہیں تو گھٹ کر مر جائے گی۔''

تیسری بہو ٹھنڈی آہ بھر کر گفتگو میں شریک ہوتی۔

''ہائے نی سکھیو! ماں کی دھی پتہ نہیں کس دیس کی مٹی ہے۔'' ''ربا! یہ بانا اس کے بدن پر کیسے

اوپراا وپرا دکھتا ہے'' وہ اس کے سیاہ تہمد اور کرتے کی طرف اشارہ کرتی ،'' کہتے ہیں اس کے دیس میں تو بڑی ٹھنڈ پڑتی ہے۔ ہائے نی! ان کلروں میں ہسڑوں میں سڑ کے سواہ ہوگئی ہے۔''

''ہائے نی! ظالموں نے بیچ دیا۔ وچھوڑ ا ڈال دیا۔''

ساری بہویں مل کر گانے لگتیں۔

''کونج وچھڑ گئی ڈاروں لبھدی سجناں نوں''

تب کوٹھا، کچی مٹی، گوبر، بھوسے اور پسینے کی بو سے بھر جاتا۔

پرسوز گیت کی صدا کوٹھے کی کچی دیواروں سے نکل کر جانوروں کے باڑے میں رینگتی رہتی، اور جانور کھونٹوں سے سر ٹکراتے اور دیواروں سے جسم مسلتے رہ جاتے۔

اس لیپا پوتی کے باوجود کوٹھا بس ڈھینے کے قریب تھا۔ بنیادوں میں چوہوں نے مستقل بسیرا کر رکھا تھا۔ اور چھت کی ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں میں چمگادڑیں دن کو سوتیں اور رات کو اڑانیں بھرتی تھیں۔ بابا عطا کے پوتوں کے پوتوں کو ایک بار پھر پکا مکان بنانے کا شوق چرایا اور انہوں نے مائی کو کوٹھڑی سے باہر نکالنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔

اس روز جب ہاڑ کی دھوپ، دھول اور کنکر پتھر جلا جلا کر انگارہ بنا گئی کیکروں کے چھال لکڑی کا بدن چھوڑ گئے اور کسان دھوپ کے بھٹے میں کھرانڈی اینٹ کی مانند پکنے لگے۔ عطا محمد کے ایک پڑپوتے نے کوٹھڑی کے دو فٹ کے در میں سے گردن اندر لٹکا کر کہا

''پٹھانی! تیرے بھائی تیرے دیس سے آئے ہیں باہر نکل کر انہیں مل''

پٹھانی کے وجود میں ارتعاش پیدا ہوا۔ جیسے برگد کے بوسیدہ تنے میں چیونٹیاں سی رینگ جائیں اور وجود کا بوجھ ٹیڑھی میڑھی بوسیدہ لاٹھی پر بچھتا چلا گیا لاٹھی کا فٹ بھر منہ مٹی میں کھب گیا۔ پھولے پھولے گول مول پاؤں اپنے محور کے گرد گھومے اور ٹیڑھے میڑھے نقوش چھوڑتے چلے گئے۔ سامنے بڑے بڑے پگڑوں اور لمبی لمبی مونچھوں والے دو پٹھان کھڑے تھے۔ پٹھانی کے پپوٹوں کے ڈھلکے ہوئے گوشت اور جھریوں کے پیچیدہ جال میں ناپید آنکھوں کی پتلیاں ساکن ہوگئیں۔ دونوں ہونٹوں کے اوپر نیچے مکڑی کا جالا سا تن گیا۔ اور ہونٹ دائرے کی شکل میں بتدریج مڑتے چلے گئے۔ جھاگ آلود سفید لعاب ہونٹوں کے گول مول سوراخ میں سے پچکاری کی دھار کی مانند ابلا اور بڑے بڑے پگڑوں اور

مونچھوں پر برس گیا۔ پگڑ اور مونچھیں تیورا کر واپس پلٹے جیسے سامنے سے غیر متوقع قوت کے ساتھ گھونسہ پڑا ہوا اور مہیب الجثہ جانوروں اور آڑے ترچھے نوکیلے کھونٹوں سے ٹھوکریں کھا کھا کر زمین بوس ہونے لگے۔

کوٹھڑی کی چھت میں سوئی ہوئی چمگادڑیں، چڑیاں اور لالیاں کوٹھڑی کی اندھی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر منہ کے بل گرنے لگیں۔ تمام حشرات الارض مٹی کی کوکھ سے ابل کر فرش پر رینگنے لگے۔ کرلاہٹ اور کلبلاہٹ سارے میں بھر گئی۔ کوٹھڑی کی چھت کے دیمک زدہ کھوکھلے تنوں، سیاہ بوسیدہ سرکنڈوں اور منوں مٹی نے سفید پلکوں کے حصار میں مقید بے نور پتلیاں اور مکڑی کے جالوں میں پیوست ہونٹوں کی گولائی سب کچھ اپنے بطن میں لپیٹ لیا۔

تاثرات

قیام پاکستان کے وقت ہمارے سامنے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ ہی ہراول دستے میں دکھائی دیتے ہیں لیکن بعد میں شوکت صدیقی، منشایاد، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام الثقلین، رام لعل، رشید امجد اور غلام عباس کے علاوہ کئی نام سامنے آئے کرشن چندر سے غلام عباس تک جدید روّیوں کی ایک کہکشاں دکھائی دیتی ہے۔ کسی نے باطنی روگ کو خارجی پہلو سے متصل کیا۔ کسی نے خارجی مسائل میں باطنی رویوں کو دیکھا۔

طاہرہ اقبال اُن افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے افسانوں کو داستان اور لوک کہانی سے علیحدہ ایک تشخص دیا۔ بدلتے ہوئے زمانے کی کروٹوں کو جزوِ افسانہ کیا۔ ان کا افسانوں پر مبنی یہ مجموعہ ''سنگ بستہ'' افسانوں کی دنیا میں ایک خوبصورت اضافہ ہے جس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اندر دبکی ہوئی اس خوفزدہ چڑیا کی مجبوری کو جزوِ الفاظ کیا ہے جو نجانے کب سے بے پری کی زد پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس کے اظہار کے لئے اس عورت سے بھی باتیں کی ہیں جو اُن کی آنکھوں میں پناہ لینا چاہتی ہے۔ انہوں نے صنفِ نازک کی اُن محرومیوں کو بھی افسانہ کر دیا ہے جو انسان بستی کے تہذیبی روّیوں نے ان کے دامن میں ڈال دی ہیں۔ وہ خود ایک عورت ہیں اور اپنے افسانوں میں بھی نسوانیت سے باہر نہیں نکل پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدت کے باوجود وہ ساحلوں کا بھرم بھی قائم

رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے موسموں کو اپنا دردسنانے کی قائل تو ہیں لیکن اُن کے بہکاوے میں نہیں آتیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے انارکلی دیوار میں چنوادی جاتی تھی اب سجادی جاتی ہے۔ پہلے یہ شہنشاہوں کا مشغلہ تھا اب تاجروں کا شغل ہے۔ پہلے پازیب ٹوٹتی تھی اب پاؤں ہی کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ بس رقصِ بسمل ہے کبھی مرمر پر کبھی شیشے پر۔ پہلے صرف جسم پتھر تھے اب پَر بھی پتھر ہیں۔ کوئی اہلِ نظر بھی ہے تو اُس کی آنکھیں پتھر ہیں۔

''شب خون'' میں جذبوں اور جاگیر کے تقابل کو موضوع بناتے ہوئے جہاں سماجی کٹھنائیوں کا تذکرہ ہے وہاں گزرتے ہوئے ماہ وسال کے اثرات کی باتیں بھی کی ہیں۔ یہ ایک ایسے جاگیردار کی کہانی ہے جو جائیداد کے لئے بیٹی کے ارمانوں کا خون کردیتا ہے۔ مثلاً روایتی جاگیردار کا یہ کہنا کہ ''میری بیٹی پر مت روؤ۔ اِس نے ثابت کردیا ہے کہ وہ کسی معمولی خاندان کی لڑکی نہ تھی۔ مجھے فخر ہے اس کی شہادت پر۔''

''تپسیا'' عورت کے ایثار کی داستان ہے اور ادلے بدلے کی بے جوڑ شادیوں کا فسانہ ہے۔ مثلاً بچے ماں کی شادی ہونے پر کہتے ہیں:

''ابھی تو باپ کی جدائی کا غم ہی ہم نہیں بھولے تھے کہ اب تو بھی ہمیں چھوڑ کر جارہی ہے نہ جا اماں نہ جا۔''

اس میں بڑے ہی متاثر کن انداز میں اس تلخ حقیقت کو عنوان بنایا گیا ہے کہ بیوگی عورت کی ایسی مجبوری ہے جس کو زمانہ خطا سمجھ کر کبھی معاف نہیں کرتا۔ بیوہ کی تباہ حالی کو یوں تصویر کرتی ہیں:

''میلی چیکٹ سفید بالوں کی لٹیں میل خوری چادر میں سے مردہ چھپکلیوں کی مانند جھول رہی تھیں۔ چہرے پر مصائب زمانہ اور جفاکش زندگی کے آثار جھریوں کے آڑے ترچھے جال کی صورت میں ہویدا تھے۔''

''آپے رانجھا ہوئی'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عورت صرف شبنم نہیں شعلہ بھی ہے۔ یہ عورت کی دیرینہ روایات کے خلاف بغاوت اور محبت کی خاطر جان دینے کا قصہ ہے۔ عورت کے ایثار کی بات ہے زہرہ تنور پر بیٹھ کر عورتوں سے کہتی ہے:

''کسی سے ڈرتی نہیں ہوں...... وچ پنچایت کہتی ہوں کہ رحیمے کی دیوانی ہوں۔ مغرور

ہے تو کیا۔ اس کا یہی غرور تو مجھے لے ڈوبا ہے۔''

''اسیرِ ذات'' جدید تہذیب کے حوالے سے پیدا ہونے والی تشنگی کی طرف اشارہ ہے:

''ہاں میں بھی انہیں میں بستی ہوں۔ ان میں رہتے ہوئے بعض اوقات محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں انہی کا ایک حصہ ہوں۔ ایسی کتاب جسے ابھی تک کسی نے نہیں پڑھا۔'' اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان جو بھی مشغلہ اختیار کرے اندر کے انسان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔

شائد اس لئے کہ وہ شاعر پہلے تھا اور ڈاکٹر بعد میں''

''مرقدِ شب'' ایک قریب المرگ شخص کے ذہنی کرب اور جذباتی کشمکش کی سرگزشت ہے۔ جس کے صحت مند بھائی کے ساتھ اُس کی محبوب منگیتر کو بیاہا جا رہا ہے۔ بیمار شخص کی بے چارگی اور منگیتر لڑکی کی بے اعتنائی کو افسانے کا عنوان دیا گیا ہے۔ مثلاً

''نجو کے دماغ کی نسیں ٹوٹنے لگیں۔ اسے لگا کہ ان کے اندر بھرے پٹرول کے کنستروں میں آگ لگ گئی ہے۔''

''یہ عشق نہیں آساں'' سطحی جذبوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تراوٹوں کا نصیب ہے۔ ''حسن کی دیوی'' اس معاشرے کا غماز ہے۔ جس میں عورت محض نمائشِ گلی میں سجا دی جاتی ہے۔ یہ مرد کی ہوس ناک فطرت کی طرف اشارہ ہے۔ ''خواب کہانی'' میں آئیڈیل نہ ملنے کے سبب پیدا ہونے والے نتائج و مسائل کو آشکارا کیا گیا ہے اور ''بھوک بھنور'' عورت کی مظلومیت اور مرد کی جنسی ہوس کا آئینہ دار ہے۔ یہ اس مجموعے کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ درد جاگ اٹھے تو حسِ لطیف بھی مر جاتی ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جو جسم کو تو ساکت کر دیتی ہے لیکن آنکھیں بہت دور دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ ان افسانوں کی بنیاد ان کے اپنے وہ مشاہدات ہیں جن کو انہوں نے اپنے گرد و پیش سے ہی تلاشا ہے۔ انہوں نے اپنے محسوسات کو انتہائی سچائی سے جزوِ افسانہ کیا ہے اور ان کے افسانوں پر کہیں بھی کہانی ہونے کا گماں نہیں ہوتا۔

طاہرہ نے جس طرح عورت کے سدا بہار پرانے دُکھ کو جدید انداز میں افسانوں کی شکل دی ہے

یہ اُن کا کمالِ فن ہے۔ اُمید ہے کہ یہ افسانہ نگاری کو ایک ایسی جہت فراہم کریں گی جس کی اس ترقی یافتہ دور کو بھی ضرورت ہے۔

فرخ زہرا گیلانی

اردو افسانہ نگاری کے دورِ زریں میں بھی مجھے راجندر سنگھ بیدی سے بڑھ کر مشاہدے کی سچائی، گہرائی اور ہمہ گیری کم ہی کہیں ملی مگر طاہرہ اقبال کے چند افسانے پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا ہے کہ گہرے اور کھرے مشاہدے کے ذریعے اپنے افسانے کو موثر بنانے کا سلسلہ بیدی پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ طاہرہ اقبال کے ہاں مجھے حیرت انگیز باریک بینی نظر آئی ہے۔ غربت وافلاس سے روندے اور کچلے ہوئے ماحول اور اس کے کرداروں کا اتنا قریبی مشاہدہ اور مطالعہ طاہرہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت حد تک منفرد ہے۔ میں ان افسانوں کی تخلیق کار کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کی استقامت کی دعا بھی کرتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

اس مجموعہ میں شامل طاہرہ اقبال کے بیشتر افسانے دیہاتی معاشرے کو اپنا موضوع بناتے ہیں مگر بہ اندازِ دگر!...... اپنے زمانے میں پریم چند نے بھی دیہاتی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا مگر اُس نے زیادہ تر دیہاتی زندگی کے معاشی اور معاشرتی مسائل کے حوالے سے افسانے لکھے تھے بعد ازاں احمد ندیم قاسمی نے زیادہ تر طبقاتی کشمکش کے حوالے سے دیہات کو دیکھا جب کہ غلام الثقلین نقوی نے دیہاتی کرداروں کی معصومیت، قوت برداشت نیز دیہات کی ثقافت میں موجود خیر کے عناصر کو منظرِ عام پر لانے میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔ ان کے برعکس بلونت سنگھ نے دیہاتی معاشرے کے متشدد روپ کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ طاہرہ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دیہات کی کنہ میں مستور "جنگل" کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے زیادہ تر دیہات کے ایسے کرداروں کے بارے میں لکھا ہے جو معاشرتی دائرے کے محیط سے چمٹے، آسیب زدہ، لبوا گلتے یا اپنے اندر کے تنور میں بھسم ہوتے ہوئے کردار ہیں۔ ان افسانوں کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں قدیم جادوئی فضاء اور اس کی پراسراریت اور ضعیف الاعتقادی کو آج کی دیہاتی زندگی میں کارفرما دکھایا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ طاہرہ اقبال نے گاؤں کو عمودی طور پر بھی دیکھا ہے اور اُفقی طور پر بھی! میرا یہ خیال ہے کہ اگر اس نے اپنے اسلوب کو مزید نکھارنے پر توجہ دی تو وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہ ایک اہم افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آ جائے گی۔

وزیر آغا

ISBN: 978-969-496-459-1